تحریک اور جمود

سیّد اسعد گیلانی

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی، دہلی

CamScanner

NEW CRESCENT PUBLISHING CO.
2035, Qasimjan Street, Ballimaran, Delhi-110006
M. : 9015603676 | E-mail : ncpcdelhi@gmail.com

₹ 50/-

CamScanner

تحریک اور جمود

تحریکی مسائل کا شعور اور کارکنان کی تحریکی تعلیم و تربیت، کسی تحریک کی پائیدار کامیابی کی بنیاد انہیں دو چیزوں پر ہوتی ہے اور کسی طاغوتی نظام کو بدلنے کے لیے ایک منظم اور مؤثر اسلامی تحریک سب سے بڑا انقلابی ہتھیار ہوتی ہے!

نام کتاب : تحریک اور جمود

مصنف : سیّد اسعد گیلانی

اشاعت اول : ۱۹۸۱ء

مطبع : بھارت آفسٹ، دہلی-۶

اشاعت ۲۰۱۴ : Sep.-2014

قیمت : 50/-

پبلشر:-

ہندوستان پبلیکیشنز

۲۰۳۵-گلی قاسم جان، بلیماران، دہلی-۶

Ph.: 011- 65363445,09015603676

CamScanner

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

(اقبال)

اِنتساب

دنیا کے ہر گوشے میں
اِسلامی نظامِ زندگی کو برپا کرنے کے لیے
سَر دھڑ کی بازی لگانے والے
رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر
قربانیاں دینے والے
تمام اسلامی تحریکوں کے علمبردار
تمام کارکنوں کے نام
ناچیز پیش کش!

سید اسعد گیلانی

CamScanner

فہرس

حرفِ اول	۱۱
۱۔ اسلامی تحریک کے اساسی عوامل	۱۵
۱۔ تحریک کی دعوت	۱۵
۲۔ فہم و شعور	۲۰
۳۔ جذبہ و لگن	۲۲
۲۔ انحطاط کے اصولی اسباب	۲۷
۱۔ تعلق باللہ میں کمی	۲۸
۲۔ یاس و قنوطیت	۳۰
۳۔ رشتوں ناطوں کا دباؤ	۳۴
۴۔ مال و دولت کی محبت	۳۶
۵۔ کاروباری مفادات کی رغبت	۳۹
۶۔ پُرآسائش بود و باش	۴۳
۳۔ انحطاط کے خارجی اسباب	۴۷
۱۔ معاشرے کا مخالفانہ ردِ عمل	۴۸
۲۔ نظریاتی عوامی قیادت کا خلاء	۵۴
۳۔ تحریک اور عوام میں عدم رابطہ	۵۷

CamScanner

۴۔ اصلاح کے محاذوں کی کثرت ۵۹
۵۔ عوام میں اسلام سے بے بنیاد خوفزدگی ۶۲
۶۔ مخالفتوں کا ہجوم ۶۴
۷۔ تحریک اور عوام میں ثقافتی فاصلے ۶۶
۸۔ تعلیم یافتہ طبقے کی کوتاہ عملی ۶۹
۹۔ متبادل سیاسی قیادت کا مسئلہ ۷۰
۱۰۔ مشتبہ امکاناتِ کامیابی ۷۴
۴۔ انحطاط کے داخلی اسباب ۸۳
۱۔ مثالی کرداروں کی کمی ۸۳
۲۔ پروگراموں کی یکسانیت ۸۸
۳۔ باہمی تعلقات میں سرد مہری ۹۱
۴۔ قائدین اور کارکنان میں خلیج ۹۵
۵۔ ذاتی محاسبے کا عدم اہتمام ۹۸
۶۔ حاصلات میں غیر معمولی تاخیر ۱۰۰
۷۔ حمیتِ حق کا زوال ۱۰۲
۸۔ سرمایۂ زندگی لگانے سے گریز ۱۰۳
۹۔ گروہ بندی کا سرطان ۱۰۵
۱۰۔ تازہ دم نئے کارکنان کی قلت ۱۰۸
۱۱۔ رضاکارانہ جذبۂ عمل کی کمی ۔ ۱۱۰

۱۲۔ مادی دوڑ میں استغراق ۱۱۲
۱۳۔ نظریہ اور کاروبار ۱۱۳
۱۴۔ مشکلات سے فرار کا رجحان ۱۱۴
۱۵۔ بلاجواز خوف و ہراس ۱۱۸
۱۶۔ مثبت پروگرام کا فقدان ۱۲۰
۱۷ فیصلہ کن اقدامات میں تذبذب ۱۲۲
۱۸ قیادت کی سُست رَوی ۱۲۴
۵۔ فکر و عمل کی بیداری ۱۳۱

CamScanner

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

نظریاتی تحریکیں کن اصولوں پر اٹھتی ہیں اور ان کی سرگرمی اور فعالیت کے محرکات کیا ہوتے ہیں۔ پھر ان میں انحطاط و اضمحلال پیدا ہونے کے امکانات و اسباب کیا کیا ہوتے ہیں؟ میں نے اپنی اس مختصر سی کتاب میں اس موضوع پر اصولی بحث کی ہے۔ توقع ہے کہ یہ بحث نظریاتی تحریکوں سے دلچسپی رکھنے والے کارکنوں کو تعلیم و تربیت میں مدد دے گی۔

ہر اسلامی تحریک ملّتِ اسلامیہ کی امانت ہوتی ہے اور اس امانت کی حفاظت ہر خادمِ اسلام کا فرض ہوتا ہے۔ جو قومیں اپنے درمیان اٹھنے والی اسلامی تحریکوں سے مستفید ہونے کی بجائے ان سے صرف نظر کرتی یا ان کی مزاحمت کرتی ہیں وہی خسارے میں رہتی ہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خود تحریکوں کو بھی اپنی کامیابی ہر دور منظور و مطلوب ہوتی ہے اور اسی مقصد کی روشنی میں وہ اپنے پروگرام اور منصوبے مرتب کرتی ہیں۔

میں نے ان مباحث میں تحریکوں پر اثر انداز ہونے والے مختلف معاشرتی، اخلاقی، اور سیاسی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اسلامی تحریکوں سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمہ پہلو سوچنے اور غور و فکر کرنے کی مشق ہو اور وہ ان مباحث کی روشنی میں اپنی کارکردگی کا محاکمہ اور محاسبہ کر سکیں۔ ان مضامین کا مقصدِ نگارش ہی خصوصاً اسلامی تحریکوں کے کارکنوں کی فکری تربیت ہے یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ ہر تحریک جو برپا ہوتی ہے وہ اپنے مخصوص نظریات و افکار لے کر آتی ہے اور انسانی معاشرے میں نفوذ کے لیے وہ اپنا مخصوص طریق کار رکھتی ہے۔ عملاً یہ

امکان خارج از بحث نہیں ہوتا کہ اُس کے افکار و نظریات خارجی حالات و واقعات کے دباؤ اور معاصر تصوراتِ حیات سے متأثر ہوں جبکہ اِس کے مخالفین بھی اس کے افکار و نظریات اور اعمال و احوال میں نقب لگانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یہ خارجی اثرات تحریک میں جس درجے میں بڑھتے چلے جاتے ہیں، تحریک اپنی کیفیت و حقیقت میں متغیر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب تک کہ اُسے چلانے والے قائدین و مفکرین تحریک کی حالت پر گہری نظر نہ رکھیں اور اُسے نامطلوب اثرات سے بچانے کی عملی اور حقیقی جدوجہد مسلسل نہ کرتے رہیں۔

میں نے اس کتابچہ میں یہی کوشش کی ہے کہ خارجی اثرات اور نامطلوب کیفیات جس جس طرف سے کسی اسلامی تحریک میں دَر آتی ہیں ان کی نشاندھی حکمت اور تعیّن کے ساتھ کی جائے۔ ان میں موہوم اندیشے بھی ہو سکتے ہیں، ذہنی مفروضات بھی ہو سکتے ہیں اور حقیقی خطرات بھی۔ بہرحال تحریک کی صحت کی ضمانت کے لیے ان سب سے بچنے کا اہتمام کرنا ضروری ہوتا ہے تاکہ تحریک اپنی حقیقی حالت میں اپنے مطلوبہ انقلاب کی منزل تک پہنچ سکے اور جس تبدیلی کا خواب اُس نے دیکھا تھا وہ عالمِ حقیقت میں رونما ہو سکے۔

یہ سارے مضامین مختلف اوقات میں رسالہ ترجمان القرآن کے صفحات میں شائع ہوتے رہے ہیں، اب ان مضامین کو کتابی صورت میں شائع کرنے سے پہلے تعلیمی اور تربیتی نقطۂ نظر سے اور بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں میں نے اِن میں مناسب ترمیم و اضافہ کیا ہے اور نئی ترتیب سے مرتّب کیا ہے۔ اگر یہ کتابچہ تحریکی مسائل کو سمجھنے، غور و فکر کے کچھ گوشے روشن کرنے اور کارکنوں کی تعلیم و تربیت میں کچھ بھی مدد دے سکے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ چونکہ اِن پہلوؤں پر منضبط بحث و نظر اور منظم غور و فکر کا یہ میرا پہلا تجربہ ہے، اس لئے میں بجا طور پر توقع رکھتا ہوں کہ اہلِ فکر و نظر حضرات اس کاوش کو

مزید بہتر بنانے میں میری فکری مدد کریں گے۔

اس کتابچہ کی ترتیب و تسوید میں برادرِ عزیز پروفیسر مختار احمد اختر صاحب شعبۂ صحافت گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسمٰعیل خاں کا خاصا دخل ہے۔ انہوں نے نہایت درجہ محنت اور عرق ریزی سے اس مسودے کی نظرثانی کی اور اُسے مفید اور مؤثر بنانے میں بہت مفید مشورے دیئے۔ ان کی اس محنت کا اعتراف کرنا میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔ یہ کتابچہ مرتّب کرنا میرے ذمے ایک اجتماعی ذمہ داری تھی جسے میں نے ادا کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ میں اس کے لئے صرف اپنے مالک سے ہی اجر کا طالب ہوں۔

اس کتاب کے بیشتر مباحث میری ان تقاریر کا موضوع بھی رہے ہیں جو میں جنیفر میں اسلامی تحریک کے کارکنوں کے تربیتی اجتماعات میں اِن موضوعات پر کرتا رہا ہوں۔ انہیں تقاریر کو ترتیب دے کر مضامین کی صورت دے دی گئی ہے۔ گویا یہ میری تحریکی زندگی کے افکار و تجربات پر مبنی تحریریں ہیں۔

منصورہ
۱۰ر نومبر ۱۹۸۰ء

اسعد گیلانی
یکم محرم الحرام ۱۴۰۱ھ

اسلامی تحریک کے اساسی عوامل

ابتدائیہ

انسان طبعی طور پر اجتماعیت پسند ہے اور اپنے معاشرے میں اجتماعی زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔ اس کے مسائل صرف اس کی ذات کی حد تک ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کے مختلف افراد اور اداروں تک پھیلے ہوتے ہیں، اس کے مسائل کا تسلی بخش انداز میں سلجھنا اس امر پر منحصر ہوتا ہے کہ اس معاشرے کی بنیادیں کن اصولوں پر قائم ہیں۔

اول روز سے انسان کو اجتماعی زندگی کے بنیادی اصول اللہ کے فرستادہ قائدینِ انسانیت، انبیاء کرامؑ کے ذریعے سکھائے جاتے رہے ہیں اور وہی انسانیت کے قافلے کے راست باز اور راست رو قائد تھے۔ اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً انہیں اس کام پر مامور کرتا رہا تاکہ وہ قافلۂ انسانیت کو راہِ راست سے بھٹکنے نہ دیں۔ انبیاء کرام کا سکھایا ہوا راہِ راست ہی صراطِ مستقیم اور دینِ حق ہوتا ہے اور اس سے ہٹا ہوا راستہ ہی باطل اور گمراہی کا راستہ ہوتا ہے جو انسان کو دنیا میں تباہی سے اور آخرت میں خسران سے دوچار کرتا ہے۔

دعوت

انبیاء کرامؑ اپنے اپنے معاشروں میں ہمیشہ اپنا پیغام ایک عمومی دعوت اور تحریک کی صورت میں لے کر اٹھتے رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ معاشرے میں ہدایت اور راستی کی رَو چلانے کی کوشش کی۔ انبیاء کی برپا کردہ تحریکیں ہر دور میں اسلامی تحریکیں تھیں اور وہ بھی اسلامی تحریکیں ہی تھیں جو انہیں خطوط پر انہیں مقاصد کے لیے انبیاء کے

پیروکاروں کے ذریعہ برپا کی جاتی رہی ہیں تاکہ انسانیت کو اس کے خالق کی طرف رہنمائی کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ انبیاء کرام کے مقاصدِ دعوت سے ہٹ کر انسانی معاشرے میں جو تحریکیں اٹھتی ہیں، وہ باطل مقاصد کے لیے ہوتی ہیں اور ان سے انسانیت کو مجموعی طور پر بہت نقصان پہنچتا ہے، انبیاء کرام اور ان کے پیرو صالحین کی دعوت ہر دور میں یکساں رہی ہے

۱۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عام کیا جائے اور اس کے حکم سے سرتابی نہ کی جائے وہی ساری کائنات کا حقیقی فرمانروا ہے۔

۲۔ اپنی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے اور ان کے احکام کے خلاف جو کچھ بھی فرد کی انفرادی زندگی یا معاشرے کی اجتماعی زندگی میں پایا جائے اُسے نکال کر زندگیوں کو خالص اطاعتِ الٰہی کے سانچے میں ڈھالا جائے۔

۳۔ انسانوں کی زندگی میں جو ہستی بھی خدا و رسول کے احکام کے علی الرغم اپنا اقتدار واختیار مسلط کرنا چاہے اُسے بزور اس منصب سے ہٹا دیا جائے اور اقتدار واختیار صرف خدا کے نیک اور مطیع فرمان بندوں کے حوالے کیا جائے۔

ہر دور میں اسلامی تحریکوں کی یہی دعوت رہی ہے جسے دعوتِ اسلامی کہا جاتا ہے۔ اسی دعوت میں توانائی اور تسخیرِ عالم کی قوت ہے اور اسی کا سکہ رواں کرنے کے لیے انبیاء آتے ہیں۔ یہی دعوت مؤمن کا مقصدِ زیست ہے۔

مسلم معاشرہ اصولی طور پر دنیا کا رہنما معاشرہ ہے۔ اُسے اسلام کو جو انسانیت کی رہنمائی کے لئے خالقِ کائنات کی طرف سے آخری پیغامِ ہدایت ہے عملی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر کے اس کی جمیت و برکت کا نمونہ انسانیت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے اور اسلام کی سب سے بڑی تبلیغ یہی ہے کہ اس کا عملی مظاہرہ دنیا کے سامنے کیا

جائے، لیکن دنیا کی بدقسمتی اور مسلمانوں کی شومئی قسمت سے اسلام دنیا کے سامنے ایک بار اپنی عظیم الشان داخلی قوت اور برکات کا مظاہرہ کر چکنے کے باوجود اب دنیا کی نظروں سے اوجھل ہے اور مسلمانوں کا عمل دنیا کو اسلام کی طرف کھینچنے کی بجائے دنیا میں اسلام کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث بن رہا ہے۔

جب کسی قوم کی شامت آتی ہے تو وہ سب سے پہلے بے عملی کا شکار ہو جاتی ہے اس کے شاندار اصول اس کے سامنے موجود ہوتے ہیں اور وہ ان اصولوں کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان بھی رہتی ہے لیکن ان پر عمل پیرا ہونے کی سکت اس کے اجتماعی عمل میں سے خارج ہو جاتی ہے۔ یہ بے عملی اور بے حسی اس قوم کے اندر ایسے تضادات پیدا کر دیتی ہے جن تضادات سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔

معاشرے کے اسی عملی تضاد کے نتیجے میں دعوائے توحید پرستی کے ساتھ بہت سی دوسری پرستشیں بھی جمع ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کے باوجود مسلمان پھر بھی فرزندِ توحید ہی رہتا ہے، اتباعِ رسالت کے دعوے کے ساتھ معروف کے تقاضوں کو توڑتی ہوئی بہت سی دوسری عقیدتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں، لیکن عشقِ رسولؐ پھر بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ قرآن کے خدا کی آخری کتاب ہونے پر ایمان کے ساتھ ساتھ غیر الٰہی قوانین کی پیروی بھی بلا کراہت ہوتی رہتی ہے، لیکن حقانیتِ قرآن کے دعوے میں پھر بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ یہ دراصل انسانی اور اخلاقی اقدار کے انحطاط کا عمل ہوتا ہے ایسی معاشرتی اور اخلاقی فضا میں قول اور فعل کا تضاد انسانی سیرت و کردار کو ناقابلِ اعتماد بنا دیتا ہے، پھر کسی محبت، رفاقت، عہد، پیمان اور ربط و تعلق پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا، اور نہ یہ وثوق باقی رہتا ہے کہ جو شخص آج بڑی بلند آہنگی کے ساتھ ایک مقصد کے لیے اپنے خلوص کا دعویٰ کر رہا ہے کل

CamScanner

وہ اس مقصد کی راہ نہیں مارے گا۔ یہ زوالِ کردار کی ایسی المناک صورت حال ہوتی ہے جہاں کسی مصلح کے لئے اصلاح کا کام بہت کٹھن ہو جاتا ہے۔ قول و فعل کی مطابقت ہی تربیت و کردار سازی کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ یہ چیز اگر پیدا ہو جائے تو زندگی کے بہت سے میدان بے معرکہ فتح کئے جا سکتے ہیں۔

تضادِ فکر و عمل کی یہ ساری فضا زوال و انحطاط کے عمل سے بنتی ہے اور اس کی موجودگی میں اعلیٰ مقاصد کے لیے کام کرنے والے ادارے بھی اپنا اثر کھو دیتے ہیں جب انقلابی نعرے بے جان الفاظ بن جائیں اور انقلابی پروگرام روزمرہ کی رسم سے زیادہ وزن نہ رکھیں تو ایسے ہی حالات ہوتے ہیں جب کسی معاشرے میں اسلامی دعوت کی تجدید ناگزیر ہو جاتی ہے۔

کسی نظامِ زندگی کو اپنانے کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ اُسے غالب کرنے کے لئے ایک تحریک اٹھائی جائے اور وہ تحریک اس کے غلبہ تک مسلسل اور پیہم حرکت میں رہے۔ وہ اپنے دامن میں افراد کو متنوع، اعلیٰ اور مختلف صلاحیتوں کے ساتھ سمیٹتی رہے، اِن صلاحیتوں کو مطلوبہ نظام کے غلبے کے لئے استعمال کرتی رہے۔ منزلِ مقصود کے کلی حصول اور اس کی بقاء و تحفظ کے لئے انقلابی آنچ دھیمی نہ پڑنے دے۔ نئے افراد کا آنا کم ہو، نہ پرانے لوگوں میں غفلت و جمود دَر آئے۔ اس لئے کہ تحریک کے لیے نو بہ نو پروگرام بنانا، اس کا آگے ہی آگے پیش قدمی کرنا، اس میں نئے آنے والوں کی مناسب تربیت کر کے انہیں اخلاقی اور علمی سطح پر تحریک کے معیار کے مطابق بنانا اور ان کی صلاحیتوں کے مطابق اُن سے کام لینا انتہائی ناگزیر عمل ہے۔ اگر یہ کام ہو رہا ہو اور مسلسل ہوتا رہے تو تحریک نہ صرف اُس نظام کے غالب آنے تک مسلسل فعّال، متحرک اور جاندار رہتی

ہے، بلکہ اس نظام کے غالب ہونے کے بعد بھی اس نظام کو اس کی اصل صورت میں لانے، اس کی مخالف قوتوں کو سرنگوں کرنے اور اس نظام کے اندر پیدا ہونے والی خرابیوں کو رفع کرنے کا اہتمام جاری رہتا ہے جس سے ایک پائیدار نظام وجود میں آتا ہے۔

ہر داعی ایک مقصد لے کر اٹھتا ہے جو اپنے اندر گوناگوں اجتماعی تقاضے رکھتا ہے۔ داعی کا خطاب پتھروں، درختوں اور دیواروں سے نہیں ہوتا، جو سمجھ سکتے ہیں نہ حرکت کر سکتے ہیں بلکہ اس کا خطاب انسانوں سے ہی ہوتا ہے۔ خدا نے جنہیں فہم کے لیے دماغ، تأثر کے لیے قلب، اور حرکت و عمل کے لئے ہاتھ پاؤں دیے ہوئے ہیں۔ جن کی اس انقلابی تحریک کے ساتھ موافقت سے تعاون اور مخالفت سے مزاحمت ظہور میں آتی ہے۔

جس طرح ہر زندگی کا پوشیدہ تقاضا موت ہے اور ہر موت کا پوشیدہ تقاضا قیامت ہے، اسی طرح ہر دعوت کا پوشیدہ تقاضا تعاون و رفاقت ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تعاون کے ساتھ ہی مخالفت اور مزاحمت بھی اُسے خود بخود حاصل ہو جاتی ہے کیونکہ جن لوگوں کو داعی مخاطب کرتا ہے وہ دعوت کا پیغام سُن کر غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ انہیں داعی کی طرف یا تو دستِ تعاون بڑھانا پڑتا ہے یا دستِ عداوت! اور یوں دعوت دورِ کشمکش میں داخل ہو جاتی ہے۔

دعوت کی حیثیت ایک ایسی مشین کی سی ہوتی ہے جو افادۂ عام کی خاطر شارعِ عام پر نصب کی جا رہی ہو۔ داعی کا کام یہ ہے کہ وہ ہر ہر شخص کو اس بات پر مطمئن کرے کہ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ اس مشین کو شارعِ عام پر نصب کیا جائے وہ اس کے فوائد گن گن کر بتائے۔ اس کے نصب کئے جانے کے خلاف جتنے

ممکن اعتراضات ہوں، ان کو رفع کرے۔ اس جگہ سے جو پرانی تعمیر منہدم کرنا مقصود ہو اس کے انہدام کی اشد ضرورت و اہمیت واضح کرے اور پرانی عمارت کی موجودگی کے نقصانات گنائے پھر ہر شخص کو ذہنی طور پر مطمئن کرنے کی کوشش کرے کہ خلقِ خدا کا فائدہ اسی میں ہے کہ پرانی عمارت ہٹا کر وہاں نئی مشین نصب کر دی جائے۔ دعوت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی اور خلق خدا تک دعوت پہنچانے کے فطری کام سے پہلو تہی کر کے کوئی تحریک انحطاط اور جمود سے نہیں بچ سکتی۔ جمود کی اس کیفیت کو توڑنے والی قوت بھی صرف دعوت ہی ہوتی ہے جس سے تحریک کی گاڑی متحرک رہتی ہے۔

فہم

کسی تحریک کی دعوت جن لوگوں کے سامنے پیش ہوتی ہے وہ لوگ پہلے پہل ہمیشہ بے توجہی سے اس نئی آواز کو سُن کر گزر جاتے ہیں، لیکن آہستہ آہستہ مختلف اسباب کی بنا پر وہ متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کبھی دعوت کا انوکھا پن اور اس کا انداز انہیں متوجہ کرتا ہے۔ کبھی داعی کی شخصیت اپنی بعض خصوصیات کے سبب لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کبھی اپنے نفع اور نقصان کی باتیں سُن کر خالص ذاتی ترجیحات کے باعث لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کبھی اپنے عزیز اور مرغوب اعتقادات و نظریات پر تنقید اور محاسبہ ان میں جھنجھلاہٹ پیدا کر کے انہیں متوجہ کرتا ہے اور کبھی بعض اہم افرادِ معاشرہ کی طرف سے تحریک کی حمایت یا مخالفت ان کو چونکا دیتی ہے۔ بہرحال بتدریج لوگ متوجہ ہونے لگتے ہیں جس کے نتیجے میں انہیں دعوت اور اس کے داعی دونوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ پھر جس نیت سے انہوں نے توجہ کی ہوتی ہے اسی نیت کے

موافق انہیں ماحول اور اسباب بھی فراہم ہو جاتے ہیں۔ اگر انہوں نے جھنجھلاہٹ اور مخالفت کی بنا پر اِدھر توجہ کی ہے تو سمجھنے کے لیے انہیں عموماً ایسے ہی لوگوں سے مدد ملتی ہے جو پہلے ہی دعوت اور داعی کی مخالفت کر رہے ہوتے ہیں۔ تاہم اگر توجہ موافقانہ ہے تو اِسی حلقۂ اثر کے لوگوں سے ان کا تعارف ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ لازم نہیں ہے کہ دعوت تک رسائی کے یہ مختلف راستے انہیں لازماً مختلف نتائج تک ہی پہنچائیں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ مخالف راستے سے آنے والے دعوت کے سرگرم حامی بن جاتے ہیں اور موافق راستے سے آنے والے دعوت کے مخالف بن کر نکلتے ہیں۔ یہ بات کچھ تو صحتِ نظر، افتادِ طبع اور زاویۂ نگاہ پر منحصر ہوتی ہے اور کچھ دعوت کے ساتھ مزاجی موافقت پر بھی مبنی ہوتی ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" تو وہ اصول یہاں بھی کام کرتا ہے۔ لیکن فہم دراصل دل و دماغ کے اطمینان کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مکّہ کے ضعفاء اور منافقین میں ایک بڑی تعداد دعوتِ اسلامی سے پوری طرح واقف اور مطمئن تھی لیکن ان کے ہاتھ پاؤں اس دعوت کے ساتھ نہ چلتے تھے۔ مدینہ کے بہت سے منافقین بھی دعوتِ اسلامی کو ذہنی طور پر درست اور برحق سمجھنے کے باوجود منافقانہ سرگرمیوں میں منہمک رہتے تھے۔ یہود کے بارے میں تو قرآن نے یہ فتویٰ تک دے دیا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں پہچانتے تھے جیسے انہیں اپنے بیٹوں کی شناخت کوئی مشکل امر نہ تھی۔ انہیں حضورؐ کی دعوت و رسالت کے بارے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن پھر بھی وہ مخالفت سے باز نہ آتے تھے۔

درحقیقت فہم اپنی جگہ کوئی ٹھوس اور مثبت شے نہیں ہے عمل ہی اُسے مثبت یا منفی بناتا ہے اور اگر یہ کوئی مثبت چیز ہے تو پھر یہ لازم نہیں ہے کہ اس کے نتائج بھی

CamScanner

ثبت ہی ہوں۔ اس کی مثال وہی ہے کہ جب ایک شخص کسی شارعِ عام پر افادۂ عام کی خاطر کوئی مشین نصب کرنا چاہے تو جو لوگ اس کے مقصد کو سمجھ لیں، اس مشین کی ترکیب، اس کی ہیئت اور میکانزم کو جان لیں، اس کے فوائد پر مطمئن ہو جائیں اور ذہنی طور پر انہیں وہاں اس مشین کے نصب کیے جانے پر کوئی اعتراض نہ رہے، تو گویا انہیں دعوت کا فہم حاصل ہو گیا۔ لیکن محض فہم کسی کام نہیں آتا جب تک تعاون و رفاقت کا گہرا جذبہ بھی دل میں موجزن نہ ہو اور وہ آگے بڑھ کر اسے نصب کرنے میں مدد دینے پر تیار نہ ہو جائیں۔ مدد کے لیے تیار ہو جانا اور عمل کے میدان میں اپنا وقت، قوت اور صلاحیت لے کر آگے بڑھنا یہی وہ حرکت ہے جہاں سے افراد کا روایتی غیر تحریکی جمود ٹوٹتا ہے، ان میں حرکت شروع ہوتی ہے۔ البتہ فرد کی تحریک اور اجتماع کی تحریک میں فرق ہے۔ اجتماعی تحریک تب وجود میں آتی ہے جب فہم حاصل کرنے والے سارے افراد حرکت میں آجائیں اور ان میں فکر و نظر اور حرکت و عمل کی ہم آہنگی بھی موجود ہو۔

جذبہ

دعوتی فہم کے بعد اس کے نتیجہ میں ایک جذبہ ابھرتا ہے۔ فہم اگر ذہن کے اطمینان کا نام ہے تو جذبہ دل کے اطمینان کا نام ہے اور دل چونکہ ارادہ و حرکت کا منبع ہے اس لیے تعاون کی تحریک حقیقتاً یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دعوت میں داعی کی طرف سے مخاطبین کے فہم کو مطمئن کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے جذبے کو ابھارنے کا سامان بھی ہوتا ہے، اور اگر کوئی فلسفیانہ قسم کی دعوت جذبہ انگیزی سے خالی ہو اور خشک الفاظ کا جادو ہی جگائے اور اس کے پیچھے انسانی جذبات کو برانگیختہ کر کے حرکت میں لانے کی قوت نہ ہو تو اسے زیادہ معاونین میسر نہیں آتے اور نہ اس کا معاشرے میں زیادہ گرمجوشی

سے استقبال کیا جاتا ہے۔

جذبہ انگیز دعوت کا نمونہ دیکھنے کے لیے قرآن کے اسلوبِ دعوت پر نگاہ ڈالیے کہ وہ کس طرح فہم کے ساتھ ساتھ جذبہ ابھارنے اور اپنے مخاطب کو متأثر کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ بڑے بڑے سرداران قریش حضورؐ کے پاس جا کر بات چیت کرتے ہوئے گھبراتے تھے کہ کہیں تاثیرِ کلام سے وہ خود متأثر نہ ہو جائیں۔ بلکہ وہ دوسروں کو بھی اسی خوف سے حضورؐ کے پاس جانے سے روکتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس تاثیرِ کلام اور اثر انگیزی کا نام انہوں نے بے عقلی یا شرارت سے جادوگری اور ساحری تک رکھ چھوڑا تھا۔ آج بھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مجموعے اٹھا کر دیکھیں تو وہاں ایسے ایسے الفاظ، جملے اور ادبی جواہر پارے ملتے ہیں کہ آدمی کا دل پہلو میں بار بار تڑپ اٹھتا ہے۔ زبان بے اختیار سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ تأثر کے سبب انسان کے رونگٹے بار بار کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پڑھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ بہترین ادبی اور فکری جواہر پارے کسی ایسے انسان کی زبان سے نکلے ہیں جو حرفوں کی دنیا سے عملاً ناآشنا تھا۔ غرض دعوت کی حیثیت اگر مشین کی ہے تو فہم و شعور اس کی افادیت اور اس کی ہیئت اور ترکیب کا شعور دلاتا ہے۔ جذبہ و جوش اس کو حرکت میں لانے والی برقی رَو ہے جس کے بغیر مشین کام نہیں کر سکتی۔ دعوت اگر گاڑی ہے اور فہم سمتِ منزل کا تعین ہے تو جذبہ اس گاڑی کی قوتِ محرکہ ہے جس کے ذریعہ کارواں منزل کی طرف جادہ پیما ہوتا ہے۔

داعی کو دعوت پیش کرنے کے لیے کسی ترغیب کی ضرورت پیش نہیں ہوتی۔ جس طرح پھوٹنے والا بیج زمین کے کئی پرت چیر کر فضائے آزاد میں کونپل کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے، اسی طرح داعی کے اندر اس کا پیغام اس کے جذبۂ صادق کی مدد سے از خود باہر پھوٹ

نکلتا ہے۔ پھر فہم و شعور کے لئے اس دعوت کو غور و توجہ سے سننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دعوت تحریری صورت میں ہے تو اُسے نہایت غور و فکر سے پڑھا جائے اور ساتھ ہی داعی کے کردار کو بھی پرکھا جائے۔ دعوت اگر زبانی ہے تو اس کی گفتگو کو سُنا جائے۔ تحریر ہو یا تقریر، داعی مخاطب کے اندر فہم و جذبہ دونوں بیک وقت اتارنے کی کوشش کرتا ہے اور مخاطب کو اپنی حمایت پر آمادہ کرتا ہے۔

صحیح فہم اور شعوری ادراک کی روشنی ایک بار حاصل ہونے کے بعد کم یا ختم نہیں ہوتی کسی مرحلے پر عارضی نوعیت کی غلط فہمی ممکن ہو سکتی ہے البتہ ایک چیز جو کسی وقت بھی مختلف اسباب سے کم و بیش ہو سکتی ہے وہ جذبہ و جوش ہے، جو برقی رَو کی مانند مشین کو حرکت میں لاتا ہے۔ بلاشبہ جذبے کی کمی تحریک میں فساد کی مختلف صورتوں کو جنم دیتی ہے۔

جذبہ و جوش طبعی عمر کے تقاضوں سے بھی کم و بیش ہوتا ہے۔ یہ دنیوی مصروفیات سے بھی متأثر ہوتا ہے۔ دعوت کے مختلف مراحل میں مشکلات کا تصوّر اور ان کا وقوع بھی اس پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ بیوی، بچے، والدین، دوست و احباب اور مال و دولت بھی اِس سرمایہ پر ڈاکے ڈالتے ہیں۔ یہ بدگمانی پیدا ہونے سے بھی کم ہو جاتا ہے۔ جس طرح ہر وقت ایک انسان کی داخلی کیفیت یکساں نہیں رہتی۔ اسی طرح اِس جذبے اور جوش کی کیفیت بھی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی۔ یہی وہ چیز تھی جس سے صحابہ کرام حضور اکرمؐ کی مجلس میں اور گھروں میں اپنے اندر تطابق نہ پاکر تشویش میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

اس قیمتی متاع کو اپنے اندر قائم رکھنا راہِ حق کے ہر مسافر کا اوّلین فرض ہے۔ مطالعۂ قرآن و حدیث سے انسان کی داخلی کیفیات میں تغیر کا سبب بھی یہی ہے کہ صاحبِ کلام سے ذہنی اور قلبی قرب حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ شعوری طور پر تو ایک بے عمل مسلمان بھی

اقرار کرتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور حضورؐ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔ اِسی طرح دعوت کو اجاگر کرنے والی دوسری تحریروں کا باقاعدہ مطالعہ بھی دل کی بیداری کے لیے اشد ضروری ہے۔ اس لیے کہ اِسی لٹریچر سے کسی شخص کو زندگی کا نصب العین اور اس کے لیے کام کرنے کا اوّلین جذبہ مہیا بھی ہوتا ہے۔

اس لیے انقلاب کے لیے دعوت ضروری ہے۔ دعوت کے لیے فہم و شعور ضروری ہے اور فہم و شعور کی وسعت کے لیے جذبہ کی فراوانی اور اخلاص کی دولت ضروری ہے۔ یہ چیزیں جب کسی تحریک میں موجود ہوں اور ساتھ ہی برابر مؤثر اور پُرحکمت اقدامات بھی کیے جائیں تو کامیابی کی منزل کی طرف تحریک بالکل فطری انداز میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔

CamScanner

انحطاط کے اصولی اسباب

ہر تحریک ہمیشہ یکساں، فعال اور متحرک نہیں رہتی۔ ایک وقت آتا ہے کہ اس میں اضمحلال وانحطاط کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، جنہیں معلوم کر کے انہیں رفع کرنا تحریک سے وابستہ ہر فرد کا فریضہ ہوتا ہے، ورنہ تحریک بتدریج مرجاتی ہے اور اس سے تعلق محض ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔

کسی تحریک کی یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی ہوتی ہے کہ مقصد کے حصول اور نصب العین تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ مضمحل اور غیر فعال ہونے لگے اور اس کے ساتھ کام کرنے والے اعضاء وجوارح اور اس کے اجتماعی ادارے بھی تساہل کا شکار ہونے لگیں۔ تحریک میں بے شمار افراد کا سرمایۂ حیات لگا ہوا ہوتا ہے، اس کا نقصان کسی ایک فرد کا نقصان نہیں ہوتا، بلکہ اس معاشرے اور قوم کا اجتماعی نقصان ہوتا ہے، جس کے ڈانڈے دور دور تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ مزید برآں جو لوگ اپنی بے بصیرتی اور کوتاہ اندیشی سے اس کی ناکامی کا باعث بنتے ہیں، تاریخ انسانیت ایسے مجرموں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اسلیے تحریک کو تباہ ہونے سے بچانا ایک اجتماعی سرمائے کو بچانے کے مترادف ہوتا ہے۔

ایک اسلامی تحریک جو اسلام کو نصب العین بنا کر اٹھتی ہے اس کے انحطاط کے اسباب دوسری دنیوی تحریکوں سے مختلف بھی ہوتے ہیں اور ممیز بھی۔ اس لیے انسانی معاشرے کی سب سے بڑی قیمتی متاع اسلامی تحریک، کو انحطاط سے بچانے اور کامیابی کی منزل تک

پہنچانے کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے کہ اس کے انحطاط کے اسباب کا کھوج لگایا جائے۔ قرآن نے جن اسباب کی نشاندھی کی ہے وہی سب سے زیادہ بنیادی اسباب ہیں اور ہم سب سے پہلے انہیں کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔

تعلق باللہ میں کمی

اسلامی تحریک درحقیقت تعلق باللہ کی تحریک ہوتی ہے۔ یہ تعلق اگر اجتماعی اور انفرادی سطح پر کمزور ہو جائے تو اس کی کمی کا مسئلہ محض اخلاقی پہلو ہی نہیں، بلکہ تحریکی پہلو بھی رکھتا ہے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ اقامتِ دین آخر کس کا کام ہے؟ اسلام جو دینِ حق ہے اُسے غالب کرنے کا آخر کون حکم دیتا ہے؟ یہ دینِ حق پوری کائنات کا حقیقی بادشاہ کسے قرار دیتا ہے۔ جس کے قوانین کا اجرا ضروری ہے؟ پھر اس کام کا اجر دینے والا کون ہے؟ کون اس کام میں مدد دینے والا ہے؟ ایک اسلامی تحریک کے لوگ سب مل کر کس کے لیے یہ کام کرتے اور کسے خوش کرنا چاہتے ہیں؟ آخر اللہ تعالیٰ یہ کیوں کہتا ہے کہ:

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (سورۃ الحج۔ ۴۰)

"اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا، جو اس کی مدد کریں گے۔"

اللہ کی مدد کس کام میں؟ اللہ کا وہ کونسا کام ہے جس کے لیے وہ اپنے بندوں کو مدد کے لیے ابھارتا ہے تاکہ انہیں آزمائے بھی اور اجر بھی دے اور اس ذریعے سے ان کی دنیا کی زندگی میں معنی و مفہوم بھی پیدا کرے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کا یہ کام اس کے دین کے غلبے کا ہی کام ہے اور اس کام میں مدد کرنا گویا اس کے اپنے ارشاد کے مطابق اللہ کی مدد کرنا ہے۔ اس امر سے کون بے خبر ہے کہ اسلامی تحریک کا پلیٹ فارم اللہ کے

اس کام کو ہی سرانجام دینے کے لیے قائم کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کام میں کوتاہی کرتا، اس سے پہلو تہی کرتا، اور عذر و معذرت اور بہانہ جوئی کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ کے اس کام میں ہی یہ سب کوتاہیاں کر رہا ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ بہت کمزور ہو گیا ہے جسے مضبوط کرنے کا ذریعہ تسبیح و تہلیل سے کہیں زیادہ یہ ہے کہ وہ میدانِ عمل میں آکر اسلامی تحریک کا فعّال کارکن بنے، اور اپنی آخرت کی زندگی میں رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے اپنی دنیاوی زندگی میں مطلوبہ راستے پر گامزن ہو۔

یہ بات کہنے میں تو بہت آسان ہے کہ میرا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے، اور ایک مسلمان کے لیے تو بندگی کا کلمہ ہی یہی ہے کہ:

اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

"بے شک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔"

اس طرح یک سو ہو کر اپنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے وقف کر دینا اور اپنی زندگی کے لیے صرف قوتِ لایموت رکھ کر باقی سب کچھ رفاقتِ الٰہی کے حصول کے لیے نچھاور کر دینا ہی ایمان باللہ اور تعلق باللہ کا عملی مظاہرہ ہے۔ کسی کی طرف سے جس درجے میں اس کا عملی مظاہرہ ہو، اس کا اپنے اللہ سے تعلق اُسی درجے میں مضبوط اور مستحکم ثابت ہوگا۔

اللہ کے کام کے لیے اٹھنا اور پھر جانی و مالی اور جسمانی آزمائشوں کے سامنے آنے پر دائیں بائیں دیکھنا اللہ کے جاں نثار بندوں کا کام نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ آزمائشوں کا دکھاوا بھی صرف انعام میں اضافہ کرنے کے لیے ہی ہوتا ہے، ورنہ یہ بار بار کا مشاہدہ ہے کہ بندے کے ظرف کو ناپ تول کر بلکہ اس سے بھی کم ہی آزمائش لائی جاتی ہے۔

CamScanner

اور اس دَوران میں بھی اس کی دست گیری اور ثابت قدمی و استقامت کا اس طرح پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے جیسے ماں بچے کو انگلی پکڑ کر چلاتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	یقیناً ان لوگوں پر جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب تو اللہ
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ	ہے اور پھر اس قول پر پوری طرح جمے رہے،
اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ	فرشتے یہ پیام لے کر اترتے ہیں کہ نہ تمہیں کسی شے
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝	کا ڈر ہونا چاہیے نہ کسی چیز کا غم، اور اس جنت پر
(حٰمٓ السجدۃ - ۳۰)	خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے

اس تعلق کو قائم کرنے کے بعد اُسے مضبوط بنانے اور مستحکم تر کرنے کے لیے ایک حساس ایمان کی ضرورت ہے جو اللہ کے احسانات کا شعوری احساس رکھتا ہو۔ اُسے اللہ کی صفتِ ربوبیت، رزّاقیت اور رحمانیت کا ہمہ پہلو ادراک ہو۔ اپنی کوتاہیوں کے مقابلے میں اس کی نوازشوں کا تصوّر کر کے وہ مالک کے احسانات کے بوجھ تلے اپنا رونگٹا رونگٹا دبا ہوا محسوس کرے۔ یہ احساس و شعور صرف مطالعۂ قرآن و حدیث اور فرائض کے ساتھ نفلی عبادات کے اہتمام سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

یاس و قنوطیت

تحریک میں جوش و خروش کے ساتھ شمولیت کے بعد بتدریج جوش ٹھنڈا پڑتے چلے جانے کا ایک اور سبب مایوسی اور قنوطیت بھی ہوتی ہے، یعنی اس کام کی دنیوی ظاہر اً کامیابی کی طرف سے مایوسی اور اس کے سبب جوش و خروش میں تدریجی اضمحلال و افسردگی۔ یہ صورت حال انسان کے ارادے کی کمزوری کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ

وہ شخص جس عزم کے ساتھ تحریک میں آیا تھا، اب وقت کے بوجھ، کام کے یکساں تسلسل اور منزل کی دوری نے اُسے ضعف سے دوچار کر دیا ہے اور اب اس کے لیے اسی جذبہ و شوق کے ساتھ آگے بڑھنا مشکل ہو گیا ہے اور غلبۂ اسلام کی جو منزل اس نے ذہن میں رکھی تھی اس کی دوری کے سبب اس کے قدم اب سست پڑنے لگے ہیں ــــ دورِ حاضر کے داعیٔ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کیفیت کا بہت خوبی سے تجزیہ کیا ہے:

"انسان ایک تحریک کی دعوت سن کر اسے صدقِ دل سے لبّیک کہتا ہے اور اول اول خاصا جوش دکھاتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے نہ اس مقصد سے حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے جس کی خدمت کے لیے وہ آگے بڑھا تھا اور نہ اُس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دِلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اس کا دماغ بدستور اُن دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بنا پر اُس نے تحریک کو برحق مانا تھا۔ اس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کے دِل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کا ذرّہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے جماعت کو چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مگر بس وہ ارادے کی

کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔"

اور ارادے کی اِس کمزوری کے پیچھے بالعموم وہ مایوسی اور ناامیدی ہوتی ہے جو مختلف اسباب کا شاخسانہ ہوتی ہے۔ مایوسی اور قنوطیت شیطان کا وہ نفسیاتی حربہ ہے جو سیدھا دِل پر وار کرتا ہے اور انسان کی قوتِ عمل اور جوشِ کردار کو معطل کر کے رکھ دیتا ہے۔ ابلیس جو مایوسی کا سمبل اور نشان ہے اگر مومن کو برائی کے راستے پر نہیں لے جا سکتا تو اُسے نیکی کے راستے پر پُرجوش تگ و دَو سے روک دیتا ہے اور یہی اس کی بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اس کے مایوسی کے وار سے راہِ حق میں لڑنے والی فوج کا ایک سپاہی زخمی ہو جائے اور دین کے محاذ پر معطل ہو کر کاروبارِ دنیا میں کھو جائے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے آخر یہ مایوسی کس سے ہے۔ اگر یہ کام خدا کا ہے تو کیا اس کے اُجرے مایوسی ہے؟ کیا اس کی ہمہ پہلو قدرت اور تقدیر کی ہمہ گیری سے مایوسی ہے؟ کیا اس کے عَدل و انصاف سے مایوسی ہے؟ کیا دنیا کے انتظام میں منصوبہ گری اور مشیت سے مایوسی ہے؟ کیا اپنے کیے ہوئے کام کی قدر افزائی اور اس کی کما حقہٗ انجام دہی پر انعام و اجر کی طرف سے مایوسی ہے؟ ہر شخص کو سوچنا چاہیے کہ آخر یہ مایوسی کس چیز سے ہے؟ کیا دینِ اسلام کا غلبہ کوئی ٹھیکے کا کام ہے جس کے عدمِ تکمیل پر پورا معاوضہ نہ ملنے کا خطرہ ہے؟ کیا یہ کسی کم استطاعت رکھنے والے مالک کا کام ہے جو شاید حسبِ حیثیت و کارکردگی معاوضہ دینے سے قاصر ہے؟ یہ مایوسی ایک بے دلیل، بے سبب، بے معنیٰ قلبی انحطاط و انتشار کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی زہریلی سرد مہری اور دِل گرفتگی ہے جو صرف شیطان کی کارستانی سے ہی وجود میں آسکتی ہے اور جس پر ایک مردِ مومن کو لاحَول

پڑھ کر اللہ کے راستے میں آگے بڑھ جانا چاہیے۔

قرآن نے بھی اللہ کے راستے میں رکاوٹوں اور اس کے دین کے لیے جد و جہد کے راستے سے روکنے والے عوامل اور اسبابِ غفلت و یاس کا تذکرہ کیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

(التوبۃ: ۲۴)

اے نبی کہہ دو! کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو بہت پسند ہیں تم کو اللہ اور رسولؐ اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ تمہارے سامنے آجائے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ اسبابِ اضمحلال و ضعف جو اللہ کی راہ میں اٹھنے والی اسلامی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد ایک مردِ مومن کی کمر کا بوجھ، اُس کے ہاتھوں کی تھکن، اُس کے پاؤں کی بیڑی، اس کے نصب العین کے راستے میں بارِ گراں بننے کا سامان اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یعنی:

۱۔ باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں و دیگر عزیز و اقارب و رشتہ دار

۲۔ مال و دولت (جو انسان نے کمایا ہوتا ہے)

۳۔ کاروبار اور تجارت (اپنی عدم توجہی اور تحریکی مصروفیات کے سبب جن کی سرگرمیاں مدھم پڑنے کا لوگوں کو ڈر ہوتا ہے)

۴۔ پرتکلف رہائش گاہیں (جو انسان کو بہت پسند ہوتی ہیں)

یہ وہ چار چیزیں ہیں جو انسان کو شعور کے ساتھ کسی اسلامی تحریک کا کارکن بننے کے بعد بھی اپنے اندر مبتلا کر کے اضمحلال، غفلت اور بالآخر جمود کا شکار کر دیتی ہیں۔

رشتوں ناطوں کا دباؤ

تاریخ کے ہر دور میں ہر اسلامی تحریک نے برپا ہونے کے بعد انہی چیزوں کی قربانی کا بار بار مطالبہ کیا ہے اور انہیں داؤں پر لگائے بغیر کوئی تحریک نشوونما نہیں پا سکتی۔ انہیں رشتوں ناطوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سورۃ المجادلہ کی آیت ۲۲ میں فرمایا گیا ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

"تو یہ کبھی نہ دیکھے گا کہ وہ لوگ جو اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہیں وہ ایسے لوگوں سے دوستی کریں جو اللہ اور رسولؐ کے مخالف ہیں۔ چاہے وہ ان کے اپنے باپ ہوں یا بیٹے یا بھائی یا قریبی عزیز، ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان اتر گیا ہے اور غیب سے ان کی مدد کی گئی ہے۔ اللہ انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہیں۔ اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ ہیں اللہ کا گروہ، اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔" (المجادلہ: ۲۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ اسلامی تحریک کے سامنے جب رشتہ داریوں

پر زد پڑنے کا مسئلہ آیا تو اُس نے معرکۂ بدر میں اس کا حیرت انگیز نمونہ پیش کیا۔

مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں[1]:

"ان کے اپنے بھائی بند سامنے تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں، کسی کا بھائی اس کی اپنی تلوار کی زد میں آ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش میں صرف وہی لوگ پورے اتر سکتے تھے جنہوں نے سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے منقطع کرنے پر تُل گئے ہوں۔"

جنگ قادسیہ میں مشہور صحابیہ حضرت خنساءؓ اپنے چاروں بیٹوں سمیت شریک ہوئیں اپنے لڑکوں کو مقابلے میں شرکت کی ترغیب دی اور انہیں شہادت کا شوق دلایا چنانچہ وہ لڑائی میں گئے اور چاروں ہی شہید ہو گئے۔ جب ماں کو بیٹوں کی شہادت کی خبر دی گئی تو ماں نے بے تابانہ کہا:

"اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ان کی شہادت سے مجھے شرف بخشا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ اُس کی رحمت کے سایہ میں اُن چاروں کے ساتھ میں بھی ہوں گی۔"

سید احمد شہیدؒ کی تحریک مجاہدین کو ہزاروں کوس دور پردیس میں جا کر راہِ حق میں جان دینے سے کوئی رشتہ و ناطہ نہ روک سکا۔ یہ وہ عارضی تعلقات ہیں جو دنیا کی چار روزہ زندگی میں کام دیتے ہیں اور قبر کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ حقیقی تعلق تو وہی ہے جسے اللہ اور اس کا رسول، حقیقی پائیدار تعلق کے طور پر قائم رکھیں۔

[1] تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۱۲۶ - ۱۲۷

مال و دولت کی محبت

مال و دولت بھی بلاشبہ راہِ حق کا بہت بڑا پتھر ہے۔ یہ انسان کو سہولت پسند، آرام طلب، خواہشات کا بندہ اور بوجھل بنا دیتا ہے۔ اسی لئے حضورؐ نے فرمایا تھا، کہ اس مال و دولت کو دائیں اور بائیں، یوں اور یوں صَرف کرو تاکہ وہ حقدار کو پہنچے اور سمٹنے کے بجائے معاشرے میں پھیل جائے۔ اسی لئے خدا اور رسولؐ کی طرف سے انفاق کا بار بار حکم دیا گیا ہے تاکہ مال کی محبت دل سے نکلے۔ چنانچہ جب لوگوں نے حضورِ اکرمؐ سے سوال کیا کہ ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خود جواب دیا:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ — آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہہ دیجئے جو ضرورت سے زائد ہو۔

گویا اللہ کی راہ میں اسلامی تحریک کی خاطر خرچ کرنے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ خرچ کیا جائے اور ضرورت کا تعین انسان بنیادی ضروریات کو سامنے رکھ کر اور اللہ اور اس کے رسولؐ سے قلبی تعلق کو پیمانہ بنا کر جو چاہے کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ خود ایک بہت بڑا مظہرِ تقویٰ ہے اور طہارتِ نفس کا بہترین اور مؤثر ترین ذریعہ بھی صدقہ ہی ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ درحقیقت قرآن کے اپنے الفاظ میں اللہ کو قرض دینے کے مترادف ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا — تم میں سے کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے؟

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مال جمع کرنے، اُسے گن گن کر اور سمیٹ سمیٹ کر رکھنے، اور پھر اس کے اپنے پاس ہمیشہ رہنے کے یقین کو ذریعۂ ہلاکت قرار دیا ہے۔ اس لازوال حقیقت کے ذیل میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں سے یوں مخاطب ہوئے تھے:

کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا، کیونکہ یا تو ایک سے عداوت رکھے گا اور دوسرے سے محبت یا ایک سے ملا رہے گا اور دوسرے کو ناچیز سمجھے گا۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے، اس لیے میں کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم اُن سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں سے ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں، وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاتتے ہیں، پھر بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمانؑ بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے اُن میں سے کسی کے مانند ملبس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے اور کل تنور میں جھونکی جائے گی۔ ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو! تم کو کیوں نہ پہنائے گا۔ اس لیے فکرمند نہ ہو کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے۔ کل کے لیے فکر نہ کرو، کل کا دن اپنی فکر آپ کرے گا۔ آج کے لیے آج کا دکھ کافی ہے[1]

معلوم ہوا کہ اللہ کے راستے میں ان لوگوں کے لیے مستعدی سے آگے بڑھنا مشکل ہوتا ہے جو حساب لگا لگا کر مستقبل کے امکانات کا جائزہ لیتے رہیں اور جب تک انہیں

---

[1] بائبل متی باب ۶۔ آیات ۲۴ تا ۳۴

تحفظ جان و مال کی مؤثر ضمانتیں نہ مل جائیں اُن کے لیے آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو جائے انقلابی کام تو ہمیشہ انہی لوگوں نے سرانجام دیئے ہیں جو سر ہتھیلی پر لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہر بازی کھیل جائیں۔ فی الحقیقت ایسے ہی لوگ اللہ کا کلمہ بلند کر سکتے ہیں۔

اس میدان میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برپا کردہ اسلامی تحریک کے کارکنوں نے عظیم الشان قربانیاں دیں اور ثابت کر دیا کہ مال و دولت اُن کے لیے واقعی ہاتھوں کے میل اور راستے کی گرد کے مانند تھا۔ اس لیے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کے سانچے میں پورے پورے ڈھلے ہوئے تھے اور اس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کی ہدایات سے اچھی طرح واقف تھے:

يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

(التوبہ: ۳۵)

(دردناک خوشخبری سنا دو اُن لوگوں کو جو سونے اور چاندی کو جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے) ایک دن آئے گا کہ سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائے گا۔

یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا ہے، لو، اب اپنی ہی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اس ذیل میں کیا تھیں حضرت اسماءؓ نے اسے یوں بیان کیا ہے:

"حضورؐ نے مجھ سے فرمایا: خرچ کیا کرو اور شمار نہ کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر شمار کرے اور بند نہ رکھا کرو کہ اللہ تعالیٰ تم پر بند رکھے۔ بس حسبِ استطاعت خرچ کیا کرو!" (متفق علیہ)

ایک اور موقع پر ایک صحابیؓ حضورؐ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"دیکھ کیا کہتا ہے ــــ!" حضورؐ نے تنبیہاً ارشاد فرمایا:

انہوں نے پھر دہرایا اور حضورؐ نے بھی یہی جواب دیا۔ تین بار دہرانے کے بعد حضورؐ نے فرمایا:

"اچھا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو فقر کے اوڑھنے بچھونے کے لیے تیار ہو جاؤ، اس لیے کہ مجھ سے محبت رکھنے والوں کی طرف فقر ایسے دوڑتا ہے جیسے پانی ڈھلوان کی طرف!"

جب رومیوں کے حملے کی خبر مدینے میں پہنچی اور حضورؐ نے مقابلے کا فیصلہ فرمایا، تو فوجی تیاری کے لیے لوگوں نے بڑھ چڑھ کر مالی ایثار کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے تجارتی قافلے کے دو سو اونٹ مال و اسباب کے لدے ہوئے اور مزید دو سو اوقیہ سونا اسلامی تحریک کو دیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا:

لَا يَضُرُّ عُثْمَانَ مَا يَعْمَلُ بَعْدَهَا

"آج کے دن کے بعد سے عثمانؓ خواہ کچھ ہی کیا کرے لیکن کوئی عمل اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

ایسا ہی نقشہ ہمیں تحریکِ مجاہدین سے وابستہ لوگوں میں بھی نظر آتا ہے لوگوں نے تحریک کے لیے جائیدادیں ضبط کرائیں اور جائیدادیں فروخت کر کر کے تحریک کو تقویت پہنچائی اور سب کچھ بیچ کر تحریک کے قافلۂ جہاد میں فقیر بن کر شریک ہو گئے۔

کاروباری مفادات کی رغبت

تجارت اور کاروبار کو تو موجودہ دورِ معاشیات میں بہت اہمیت حاصل ہے

تاہم یہ تحریک کے راستے کی بہت بڑی چٹان بھی بن سکتا ہے کیونکہ اگر یہ تحریک کو مالی تقویت پہنچانے میں مددگار ہوں تب تو ان کی افادیت مسلّم ہے، لیکن اگر یہ راہِ حق میں قدم اٹھانے میں پاؤں کی بیڑی بن جائے تو پھر یہ راہِ حق کا ایک ایسا پھندہ ہے جسے انسانی زندگی میں اس کی حیثیت کے مطابق محدود اور قابو میں رکھنا مردِ مومن کا فرض بن جاتا ہے۔ یہ بھی آخرت فراموشی کا ہی ایک پہلو ہوتا ہے کہ انسان دنیا کے معاملات میں گردن تک دھنسا ہوا، اپنے سارے فرائض اور دوسروں کے سارے حقوق سب کچھ بھول جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت دنیا سے بدرجہا بہتر ہے لیکن حاضر و موجود میں مبتلا انسان غائب و غیر محسوس آخرت کا ادراک و احساس کرنے میں کوتاہی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ (الاعلیٰ)

تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے۔

دوسری جگہ کاروبارِ دنیا کی مرغوبیت پر تبصرہ کرتے ہوئے خود قرآن نے فرمایا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (العمران: ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان لگے ہوئے گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔

یہاں کاروبارِ دنیا کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن نے چند مزید اسبابِ غفلت و تساہل کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن میں پہلی چار چیزوں کے علاوہ دو چیزوں کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ ایک تو مویشی

(دودھ والے، سواری والے اور زمینیں جوتنے والے جانور) اور دوسری زرعی زمینیں (فصلیں باغات، ٹیوب ویل اور متعلقہ زرعی ساز و سامان)۔

ظاہر ہے کہ مویشیوں کے اوقاتِ کار کردگی کے ساتھ بندھا ہوا مجبور و پریشان انسان اور زمینوں کی فصلوں کا سخت پابند آدمی کسی انقلابی تحریک کے ساتھ کیا انقلابی کارنامے سرانجام دے سکتا ہے۔ جب تک ان کا انقلابی جذبہ ان چیزوں کو اس کے اصول و نظریے کا پابند نہ بنائے اور ان کاموں کے پروگراموں کو اپنے تحریکی پروگراموں کے تحت نہ رکھے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دین کے کام کے لیے اپنے بندوں سے اس کاروبار اور تجارت کی اصطلاح میں بھی بات کی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الصف: ۱۰-۱۱)

اے مسلمانو! کیا میں تمہیں ایسی سوداگری بتاؤں جو تم کو آخرت کے دردناک عذاب سے بچا لے! وہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ! اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہ تجارت تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کے کارکنوں نے اللہ کے ساتھ ایسی ہی تجارت کی انتہائی درخشاں مثالیں پیش کیں۔ اس لیے وہ تھوڑے وقت میں بہت بڑا انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے جمے جمائے پھیلے پھیلائے وسیع کاروبار کو تحریک کی ضروریات کی خاطر اللہ کی راہ میں بالکل بیٹھ جانے دیا اور اپنی ساری مساعی کا محور و مرکز صرف اللہ کے دین کی سربلندی کو ہی قرار دے لیا۔ یہی حال اُن کے دوسرے ساتھیوں کا ہوا۔ جو لوگ ملک چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے آخر وہ اپنے کاروباروں کو ٹھپ کر کے ہی

جاسکے اور جو لوگ اپنے کاروبار مکّہ میں چھوڑ کر مدینے کی طرف ہجرت کر گئے ظاہر ہے کہ وہ اپنے کاروبار اپنے ساتھ تو نہیں لے گئے تھے۔ انہوں نے اسلامی تحریک کے لیے قربانی کی ایسی مثال پیش کی جس کا نمونہ انسانی تاریخ میں دوسرا کوئی نہیں ملتا۔

حضرت صُہیب رُومیؓ مکّہ میں بہت بڑے تاجر تھے۔ جب وہ ہجرت کے لیے اپنا سَرو سامان لے کر شہر سے باہر نکلے تو قریشِ مکّہ نے پکڑ لیا اور کہا کہ "یہاں جب تم ہمارے شہر میں آئے تھے تو خالی ہاتھ آئے تھے۔ تم نے ہمارے ہی شہر میں کاروبار اور تجارت کر کے اتنا اثاثہ بنالیا، اب اسے کہاں لیے جاتے ہو؟" حضرت صہیب رومیؓ نے اپنا سب کچھ اُن کے حوالے کیا اور تہی دست ہو کر مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو حضور اکرمؐ تک صحابہؓ نے صہیبؓ کے یوں لُٹ پٹ کر خالی ہاتھ پہنچنے کی خبر پہنچائی۔ حضورؐ نے صہیبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"صُہیبؓ تم نے اپنے رب کے ساتھ بہت اچھا سودا کیا۔ مبارک ہو!"

یہ بات کہنے والے بھی جانتے تھے اور سننے والے بھی کہ واقعی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اتنا بڑا محفوظ سودا ہے جس کے نفع کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بس اس کے لیے خلوص اور انتظار کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کئی گنا ہو کر اُس وقت اُسے واپس ملے گا جب اُسے اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ ساتھ ہی اُسے مزید اپنے رب کی خوشنودی ملے گی جو انمول ہے اور جس کا کوئی بھی بدل نہیں۔

اسی طرح بعد میں بھی جن لوگوں نے اسلامی تحریک کا کام کیا، انہوں نے اپنے کاروبار اور تجارت کو اس راہ میں ہمیشہ قربان کیا۔ تحریکِ مجاہدین سے وابستہ ہزاروں مجاہدین اپنے کاروبار چھوڑ کر تحریک میں شامل ہوئے اور صُوبۂ سرحد جا کر محاذِ جنگ میں شہید ہوئے۔ ہزاروں

لوگ کاروبار میں کئی کئی ماہ تک غیر حاضر رہتے۔ ایسا بھی ہوا کہ کئی لوگ مجاہدین میں شامل ہو کر جہاد کرتے اور پھر واپس آ کر کاروبار میں مصروف ہو جاتے تاکہ تحریک کو مالی امداد بھی پہنچائی جاسکے۔ جو لوگ تحریک سے مالی تعاون کرتے رہے، ان کی جائیدادیں اور کاروبار فرنگی کافر حکومت نے ضبط کیے اور انہوں نے ہنسی خوشی یہ قربانیاں گوارا کیں تاکہ وہ اپنے مالکِ حقیقی کو خوش کر سکیں، اس لیے کہ وہی ہر شے کا مالک ہے اور ہر شے اسی کی طرف سے ہے۔

پُرآسائش بُود و باش

گھر بار اور پُرتکلّف رہائش گاہیں بھی انسان کے لیے بعض اوقات آزمائش بن جاتی ہیں۔ اپنے آباد گھروں اور مادّی معمولات کو چھوڑ کر غیر معمولی حالات کو خوشی خوشی گلے لگانا آسان امر نہیں۔ اپنے معمول کے مرغوب کھانے، معمول کے آرام دہ بستر، روزمرّہ کے کام کاج اور بیوی بچّوں اور عزیزوں کی قربت آخر کسے پسند نہیں ہے۔ لیکن اللہ کا حکم تو یہی ہے کہ اس کے راستے میں جب اس کے دین کا مطالبہ ہو، اِن مرغوباتِ نفس کو قربان کر کے راہِ حق میں نکلا جائے۔ جس درجے میں کوئی شخص ان چیزوں کے گھیرے میں زیادہ پھنسا ہوا ہوگا، اسی قدر وہ بوجھل ہوگا اور جس قدر ان چیزوں کا دباؤ کم ہوگا، اتنا ہی وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور تفکّرات سے دُور محسوس کرے گا۔

تاہم اللہ کی دعوت کا تقاضا ہے کہ اسلامی پکار سنتے ہی تحریک کی جدوجہد میں شامل ہو جاؤ

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا ۔ نکلو اللہ کی راہ میں ہلکے ہو یا بھاری۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی کیفیتِ قلبی کو خوب جانتا ہے اور ان کے مرغوبات سے بھی خوب آگاہ ہے، اس لیے کہ وہ خالقِ فطرت ہے۔ چنانچہ دین کے لیے جدوجہد کرنے والے

مجاہدین سے ان مرغوبات کی قربانی طلب کر کے، پھر آخرت میں ان سے لاکھوں گنا بہتر مرغوبات کا وعدہ بھی بار بار کیا گیا ہے، گویا ان تمام مرغوبات کو مستقل، پائیدار اور کامل صورت میں پالینے اور حقیقی طور پر متمتع ہونے کا مقام دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے جہاں مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ دینے کا وعدہ مضبوط اور مستقل ہے۔

اِس سلسلے میں بھی اِسلامی تحریک سے وابستہ لوگوں نے درخشاں مثالیں پیش کی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے یہ مسئلہ آیا تو وہ بلاجیل وحجت دعوتِ دین کی خاطر دیس دیس کی خاک چھانتے رہے۔ حضرت موسیٰؑ کے سامنے آیا تو انہوں نے بھی ساری عمر مسافرت اور صحرانوردی میں ہی گزار دی۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی اسلامی تحریک کے سامنے آیا، تو اس کے کارکنوں نے بھی اپنے کامیاب کاروبار اور آباد گھرانے تج کر اس کے لیے پردیس کا راستہ اختیار کیا اور کسی کی پُرآسائش زندگی اس کا راستہ نہ روک سکی۔ اسی طرح مجاہدین کی تحریک میں بھی ہزاروں لوگوں نے اپنے گھربار چھوڑ دیے اور پردیس میں نکل گئے۔ اور یوں کہ بظاہر انہیں دوبارہ ان گھروں میں واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی اس لیے کہ انہیں اپنی آخرت کی بڑی کامیابی کا حتمی ایمان حاصل تھا۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ (التوبہ: ۲۰)	اللہ کے ہاں تو اُنہی لوگوں کا بڑا درجہ ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جانفشانیاں کیں اُنہی کامیاب ہیں۔

پھر مزید فرمایا گیا:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا	جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب ایمان لانے

فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النحل: ۱۱۰)	کی وجہ سے ستائے گئے، تو انہوں نے گھربار چھوڑ دیے، ہجرت کی، راہ خدا میں سختیاں جھیلیں اور صبر سے کام لیا، ان کیلئے یقیناً تیرا رب غفور و رحیم ہے۔

غرض گھروں سے نکلنے اور راہِ حق میں جاں گسل جدوجہد کی مثالیں اسلامی تحریک کی تاریخ میں ہر دور میں موجود ہیں اور پھر جس قدر درخشاں مثالیں کسی تحریک نے پیش کی ہیں، اُسی قدر خوش آئند اور پائیدار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

بلاشبہ رب العالمین اپنے بندوں کو مرغوباتِ نفس کے ذریعہ آزماتا ہے اور جو اِن مرغوبات میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ غفلت کا شکار ہو جاتے اور اپنے مالک کی خوشنودی کی منزل سے دُور تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انحطاط کے خارجی اسباب

کسی تحریک کے انحطاط و اضمحلال کے اسباب میں صرف انہیں عوامل کا ہاتھ نہیں ہوتا جو اصولی اور اساسی ہوتے ہیں بلکہ جس معاشرے میں وہ کام کرتی ہے اس کے خارجی حالات و اسباب بھی تحریک پر اثر انداز ہوتے اور اُسے انحطاط و اضمحلال کا شکار کرتے ہیں۔

ہر تحریک انسانی معاشرے میں کسی نہ کسی انقلاب اور تغیر کی داعی ہوتی ہے اور ہر ایسے تغیر میں اصلاح کا پہلو ہمیشہ مضمر ہوتا ہے۔ اس کا مطلوبہ تغیر یا انقلاب، تحریک کی دعوت اور پروگرام کی روشنی میں معاشرے کے ہر شخص پر واضح ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک اسلامی تحریک ایک مکمل اسلامی انقلاب کی داعی ہوتی ہے اور اس کی منہاج گزشتہ دَور کی تمام اسلامی تحریکوں کی جدّوجہد میں بنظر غائر دیکھی جا سکتی ہے۔ دَورِ حاضر میں بھی سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ برصغیر میں، امام آیت اللہ خمینی ایران میں اور امام حسن البنا شہیدؒ مصر میں اپنی اسلامی تحریکوں کی دعوت نہایت جذبہ انگیز انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ فرد کی اصلاح، معاشرے کی اصلاح اور قیادت کی اصلاح کے فارمولے کو دنیا کے ہر معاشرے، تاریخ کے ہر دَور اور دُنیا کے ہر ملک میں آزمایا جا سکتا ہے ـــــ یہ اصلاحِ اجتماعیت کا آزمودہ فارمولا ہے۔ اس فارمولے کو غلامی سے دوچار معاشرے سے لے کر ایک ملوکیت زدہ اور پس ماندہ معاشرے تک کو جگانے کے لیے ہمیشہ آزمایا جا سکتا ہے۔

معاشرے کا مخالفانہ ردّعمل

کسی تحریک کے پھلنے پھولنے اور نشو ونما پانے کی رفتار میں کمی بیشی کا معاشرے کے ردّعمل پر بھی بہت بڑا انحصار ہے۔ معاشرے کی حیثیت زمین کی سی ہوتی ہے۔ زمین زرخیز ہو تو بیج جلد نشو ونما پاتا ہے۔ کمزور ہو تو فصل کمزور ہوتی ہے، اور زمین بنجر اور شوریائی ہو تو اچھا بیج بھی نشو ونما نہیں پا سکتا اور ضائع ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر دعوتِ انقلاب ایک ایسی پُرزور حرکت ہوتی ہے جس کا ردّعمل سامنے آنا فطری بات ہے۔ تحریک کو موافق لوگ بھی میسّر آتے ہیں، مخالف بھی ملتے ہیں اور اسے غیر متعلق، بے حس اور بے نیاز لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ قرآن نے انبیاء کی دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی جو اخلاقی کیفیت سورۂ بقرہ میں پیش کی ہے۔ اِس آئینہ میں دورِ حاضر کی ملّتِ مسلمہ بھی اپنا رُخ کردار دیکھ سکتی ہے۔ اس کے ذریعہ کتابِ الٰہی کو قیامت تک آنے والی انسانیت کے حوالے کرتے ہوئے سورت کے آغاز میں ہی دعوت کے مقابلے میں نمودار ہونے والے تین انسانی گروہوں کا تعارف کرا دیا گیا ہے اس طرح انسانی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے کسی تحریک کے مقابلے میں ایک معاشرے کا جو نفسیاتی اور اصولی ردّعمل ہو سکتا ہے وہ واضح طور پر پیش کر دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں کافر معاشرے میں اُٹھنے والی دعوت کے ردِّعمل کا نقشہ کچھ اس طرح ہے کہ پہلا گروہ دعوت کی حقانیت کو تسلیم کر لینے والوں کا ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَ

(ہدایت ہے) اُن لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔ تم پر نازل

بِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(البقرۃ: ۳-۵)

کی گئی کتاب (قرآن) اور تم سے پہلے نازل کی گئی تمام کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اِس کے بعد معاشرے کے اُس گروہ کا تعارف ہے جو تردید اور مخالفت کو ہی اپنا مسلک بنا لیتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

(البقرۃ: ۶)

جن لوگوں نے (دینِ حق کو) تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا، ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہرحال وہ ماننے والے نہیں!

پھر اس کے بعد ایک تیسرے گروہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝

(البقرۃ: ۸)

بعض لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔

یہ نقشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی دعوت کے مقابلے میں ایک کافر معاشرے کے ردّعمل کا ہے اور قرآن دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں ردِّعمل کے یہ تین نمونے پیش کر کے معاشرے کے تین قسم کے افراد کے الگ الگ گروہ بیان کرتا ہے۔ اب اگر پہلا گروہ قوت پکڑ لے تو بالعموم تیسرا گروہ اپنے مفادات کو اس کے ساتھ وابستہ سمجھ کر کبھی مزاحمت نہیں کر پاتا۔ بس صرف زیادہ سے زیادہ غیر فعّال اور غیر مؤثر رہتا ہے۔ لیکن دعوت قبول کرنے والوں کا گروہ قلیل اور غیر مؤثر ہو جائے تو تیسرا گروہ بالعموم کھلم کھلا انکار کرنے والوں کا ساتھ

دیتا ہے۔ لیکن ایک بگڑے ہوئے معاشرے میں چاہے ایک منظم جمہوری حکومت ہو یا نام نہاد جمہوریت، جب بھی تجدیدِ دعوت کے لیے ایک تحریک چلائی جائے گی تو کچھ اسی قسم کی صورت پیدا ہوگی بالعموم دعوت کی تائید کرنے والے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے علاوہ بھی معاشرے کی ایک کثیر آبادی غیر جانبدار اور غیر متعلق رہ کر، بے نیازی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وہ ایسے خاموش تماشائیوں کا ہجوم ہوتا ہے جو پہلوانوں کا دنگل دیکھنے کے لیے جمع ہو گیا ہو اور اسے کسی پہلوان سے بھی کوئی دِلی لگاؤ نہ ہو۔ انہیں زیادہ سے زیادہ اس سے غرض ہے کہ جو بھی دنگل میں کامیاب رہے اسی کے گلے میں سب سے پہلے ہار ڈالنے کے لیے دوڑیں۔ ایسے لوگوں کو فریقین کی اچھائی برائی اور حق و ناحق سے کوئی سروکار نہیں ہوتا اور حقیقت یہ ہے کہ ان چیزوں کا انہیں کوئی واضح شعور بھی نہیں ہوتا۔ مخصوص کیفیات کے حامل ایسے معاشرے میں دعوت کے مقابلے میں قرآن کے نشان کردہ وہی تین گروہ اس صورت میں نمودار ہوتے ہیں:

۱۔ موافقین ۲۔ مخالفین ۳۔ غیر جانبدار خاموش تماشائی

واقعتاً تحریک کی نتیجہ خیز کارکردگی اور اس کے نتائج کا تعلق ان گروہوں کے باہم تناسب پر ہوتا ہے جب تک پہلا گروہ تیسرے گروہ کی غیر جانبداری کی برف کو پگھلا کر اُسے تحریک کے دعوتی بہاؤ میں نہ بہالے جائے اس وقت تک معاشرے میں انقلابی تصورات کے گہرے نفوذ کے مؤثر مواقع پیدا نہیں ہوتے۔ غیر جانبدار لوگوں کی کثرت سے تحریک کا غیر مؤثر ہو کر مضمحل ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہوتا۔ تحریک کی مؤثر پذیرائی نہ ہونے سے دل بتدریج بجھنے لگتے ہیں اور قوتِ کار ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام صدیوں تک دیدہ ریزی کے ساتھ دعوتِ اسلامی پیش کرتے رہے، لیکن مخالفین اور غیر جانبداروں

کی کثرت کی بنا پر پتھر دل موم نہ ہو سکے۔

کسی تحریک کے لیے یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کوئی معاشرہ اس کی دعوت کی طرف صدقِ دل سے متوجہ نہ ہو، اُسے کوئی اہمیت دے اور نہ اس کی مؤثر مخالفت کرے جس سے کارکنوں میں چیلنج کا مقابلہ کرنے کی جرأت و شجاعت پیدا ہو سکے۔ معاشرے کی طرف سے بے حسی اور عدم پذیرائی بھی عموماً تحریک کے اندر تدریج جمود کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔

کسی معاشرے میں ایسے افراد کا نقشہ قرآن نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (الاعراف: ۱۷۹)

اُن کے پاس دل ہیں مگر وہ اُن سے سوچتے نہیں۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں مگر وہ اُن سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی زیادہ گئے گزرے (دراصل) یہ وہ لوگ ہیں، جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں۔

ایسی صورت حال دعوت کے لیے نہایت سنگلاخ ہوتی ہے اور اس کے نفوذ کے عمل میں سدِّ راہ بن جاتی ہے۔ نتیجتاً تحریک کے اندر مایوسی اور قنوطیت کا پیدا ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ اس کیفیت کو رفع کرنا اور معاشرے کے ضمیر پر جمی ہوئی اس سنگین تہہ کو توڑ کر اس میں دعوت کا بیج ڈالنا سخت مشکل امر بن جاتا ہے۔

ایسی صورت میں سب سے اہم طریقہ کار دعوت سے بے خبری کو باخبری سے، بے علمی کو علم سے اور عدم آگہی کو آگہی سے بدلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے، جیسے کسی کسان کو بنجر اور سنگلاخ زمین آبادکاری کے لیے دے دی جائے۔ ایسی

زمین محنت زیادہ مانگتی ہے کیونکہ جن حالات میں ایک کسان زرخیز زمین میں فصل اُگاتا ہے اس سے کہیں زیادہ سنگین تر حالات سے دوچار ہو کر ہی سنگلاخ اور بنجر زمین کو آباد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے معمول کی محنت، تدابیر، آلات اور اوقاتِ کار کافی نہیں ہوتے، بلکہ غیر معمولی حکمت کار کی ضرورت ہوتی ہے۔

موجودہ مسلمان قوم کی اسی ذہنی، اخلاقی اور نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ژرف نگاہی نے کچھ یوں کیا ہے:

"جس قوم میں کام کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں، صدیوں کے مسلسل انحطاط نے اس کے اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اس میں کیریکٹر کی وہ طاقت بہت ہی کم باقی رہ گئی ہے جس کی مضبوط چٹان پر اصل فیصلے، مستقل ارادے، ثابت عزائم اور بھروسے کے قابل عہد و میثاق قائم ہوتے ہیں۔ اس میں مدت ہائے دراز سے یہ کمزوری پرورش پا رہی ہے کہ ایک چیز کو حق جانیں اور دل سے اُسے حق مانیں، مگر اس کے لیے کوئی قربانی گوارا نہ کریں۔ نہ وقت کی، نہ مال کی، نہ خواہشاتِ نفس کی، نہ اپنے مرغوب افکار و نظریات کی، نہ اپنے جاہلیت کے اذواق اور دلچسپیوں کی اور نہ کسی اور چیز کی۔ انہیں وہ حق پرستی تو بہت اپیل کرتی ہے جس میں حق کو زبان سے حق کہنا اور اس پر لفظی عقیدت کے پھول نچھاور کرنا اور اس کے لیے چند نمائشی کام کر دینا کافی ہو اور اس کے بعد انہیں اس حق کے خلاف ہر طرح اپنے کاروبار، اپنے ادارے اور اپنی زندگی کے سارے معاملات

چلانے کی پوری آزادی حاصل رہے۔ اسی لئے وہ نام نہاد مذہبیت کے اُن راستوں کی طرف خوشی خوشی لپک جاتے ہیں جن کی دینداری اور سعی و عمل کا سارا مدار اسلام اور جاہلیت کی مصالحت (COMPROMISE) پر ہے، لیکن ایسی حق پرستی اُن کے لئے ایک ناقابلِ تحمّل بارِ گراں ہے جو کفر و اسلام، حق و باطل اور اطاعت و بغاوت کے درمیان دو ٹوک فیصلہ چاہتی ہو اور جس میں ہر اُس شخص سے جو حق کو ماننے کا اقرار کرے، پہلا مطالبہ یہ ہو کہ وہ یکسو ہو جائے۔ پھر مزید مطالبہ یہ ہو کہ جس چیز کو حق مانا ہے اس کے لئے اپنی پوری شخصیت کو تج دے اور عمر بھر کے لئے تج دے، اور اس کے لئے ہر قسم کی قربانیاں گوارا کرے، اور ایک دو دن کے لئے نہیں، بلکہ جب تک جیتا ہے اس وقت تک گوارا کرتا رہے۔ ایسے گئے گذرے زمانے میں بھی ایسے بہت سے مسلمان مل جائیں گے جو اسلام کے لئے خوشی خوشی سینے پر گولیاں کھالیں گے، سَروں پر لاٹھیوں کی بارش سہہ لیں گے۔ یہ سب کام ان کے لئے ہلکے ہیں لیکن اپنی پوری زندگی کو اسلام کے ضابطے میں کَس دینا اور صبر کے ساتھ اس کی اخلاقی ذمہ داریوں کو قبول کر کے نبھانا، یہ اُن کے لئے بہت بھاری بوجھ ہے جس کی سہار اُن کیلئے سخت دشوار ہے۔" [1]

غرض ایک فعّال تحریک کا کام یہ ہے کہ وہ بالکل یکسو اور باعمل لوگ تیار

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ دوم صہ ۱۷-۱۸

کرتی چلی جائے اور غیر جانبدار لوگوں کے اُنبوہِ کثیر کو کم کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرتی رہے۔ اِسی طرح معاشرے میں اسلامی انقلاب کا عمل تدریجاً آگے بڑھ سکتا ہے۔

نظریاتی عوامی قیادت کا خلاء

جمہوری معاشرے میں انقلاب کی داغ بیل ڈالنے کے لئے ذیلی اور علاقائی قیادت کی نمود عملی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر معاشرے کو مطلوبہ رُخ پر چلایا نہیں جاسکتا۔ اسی لئے دورِ جدید میں اٹھنے والی اسلامی تحریک کے داعی نے عوام میں نفوذ کے لئے ہر سطح پر سب سے پہلے اِسی نظریاتی اور جمہوری قیادت کی تشکیل کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

"ہمیں عوام میں عمومی تحریک (MASS MOVEMENT) چلانے سے پہلے ایسے آدمیوں کو تیار کرنے کی فکر کرنی ہے، جو بہترین اسلامی سیرت کے حامل ہوں اور ایسی اعلیٰ درجے کی دماغی صلاحیتیں بھی رکھتے ہوں کہ تعمیرِ افکار کے ساتھ اجتماعی قیادت کے دوسرے فرائض کو بھی سنبھال سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں عوام میں تحریک کو پھیلا دینے کے لئے جلدی نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری تمام تر کوشش اس وقت یہ ہے کہ ملک کے اہلِ دماغ طبقوں کو متاثر کیا جائے اور ان کو کھنگال کر صالح ترین افراد کو چھانٹ لینے کی کوشش کی جائے جو آگے چل کر عوام کے لیڈر بن سکیں۔" [1]

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اوّل ص ۹۱-۹۲ (تقریر سیّد مودودیؒ امیر جماعت اسلامی)

گویا ان کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی جمہوری اسکیم یہ تھی کہ معاشرے میں سے چھانٹ کر با اصول، باکردار اور بابصیرت قائدانہ صلاحیت رکھنے والی ایک ایسی ٹیم تیار کی جائے، جو اسلامی انقلاب کی جانگسل کشمکش میں خود بھی ڈٹ جائے اور عوام کو بھی اپنے ساتھ لے کر چل سکے۔ آگے چل کر انہوں نے فرمایا:

"ہمارے پیشِ نظر صرف یہ نقشہ ہے کہ عوام کی سربراہ کاری کیلئے ایک ایسی مختصر جماعت فراہم کر لی جائے جس کا ایک ایک فرد اپنے بلند کیریکٹر کی جاذبیت سے ایک ایک علاقہ کے عوام کو سنبھال سکے، اس کی ذات عوام کا مرجع بن جائے اور کسی مصنوعی کوشش کے بغیر بالکل فطری طریقے سے عوام کی لیڈرشپ کا منصب اُسے حاصل ہو جائے مگر صرف مرجعیت سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ اس سے کام لینے کے لئے دماغی صلاحیتیں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ان مرکزی شخصیتوں کے ذریعہ سے عوام کی قوتیں مجتمع اور منظم ہو کر اسلامی انقلاب کی راہ میں صرف ہوں۔" [1]

غرض تحریک میں روانی، وسعت، گہرائی اور اثر اندازی پیدا کرنے کے لئے ایک مؤثر ٹیم کی ضرورت ناگزیر ہے، جس کے بغیر تحریک مؤثر طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکتی ایک تحریک اگر فطری نتائج دکھانے میں کوتاہ نظر آئے تو دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ اس اہم سبب کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ قائد کے ہراول دستہ میں کیسے لوگ شامل ہیں۔ داعیٔ تحریک اور اس کے قریبی رفقاء کی مثال کھیل کے میدان عمل میں کیپٹن اور ٹیم کی ہوتی ہے۔ ٹیم کے ارکان باصلاحیت اور جاندار نہ ہوں تو کیپٹن

[1] روداد جماعت اسلامی حصہ اول ص ۹۱-۹۲ (سیّد مودودیؒ)

کی ذاتی کارکردگی کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے سے معذور رہتی ہے۔ اس حقیقی عامل کے بغیر تو وہ تحریکیں بھی مادی نتائج پیدا نہ کر سکیں، جن کو نبیوں کی قیادت میسّر تھی۔ ممکن ہے اگر انہیں بھی حضور اکرمؐ کے انقلابی رفقاء کی مانند ایک مؤثر، جاندار اور جانباز ٹیم میسّر آتی تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ کسی داعئ تحریک کیلئے ٹیم کا مسئلہ ایک بنیادی اور اہم مسئلہ ہے۔ یہ تحریک کی کارکردگی کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتا ہے۔ ایک نظریاتی تحریک کے لئے ایسے جتھے کی اہمیت واضح ہے جو معاشرے کے مختلف طبقات اور ملک کے مختلف گوشوں میں موجود ہو اور تحریک کی مؤثر ذیلی اور علاقائی قیادت ثابت ہو۔ مذکورہ قیادت ہر معاشرے کا مستقل اور لازمی حصہ ہوتی ہے۔ قبائل کی سرداریاں، علاقوں کی چودھراہٹیں اور برادریوں کی سربراہ کاریاں، سبھی ذیلی قیادت اور علاقائی قیادت کے مختلف روپ ہیں اور کم و بیش یہی ذیلی قیادت ہر تحریک کو کام دیا کرتی ہے لیکن اگر ان میں کچھ لوگ فعّال نہ ہوں تو عوامی دباؤ پڑنے سے کام نہ دینے والی ذیلی قیادت خود بخود بدل جایا کرتی ہے اور یا پھر نئے تقاضوں کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ اسلامی تحریک کے لئے اس ذیلی قیادت میں تین صفات کا ہونا لازمی ہے۔ یہ وہ صفات ہیں جو دورِ حاضر کے ماہر تحریکاتِ اسلامی سیّد مودودیؒ نے ذیلی قیادت کی خصوصیات بتاتے ہوئے نہایت دلنشین انداز میں مختلف مواقع پر بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

۱۔ وہ اپنے پورے علاقے میں سیرت و کردار میں ممتاز و ممیّز اور ہر مجلس میں مطلوب و معروف اور نمایاں ہوں۔

۲۔ وہ خدمتِ خلق، سماجی خدمات اور عوامی مسائل و مشکلات میں حصّہ لینے میں سب سے آگے

آگے ہوں۔

۳۔ وہ اپنے جوش و جذبہ، مضبوط کردار، شجاعت و بہادری کے ساتھ نڈر، بے خوف اور دبنگ ہوں۔

اِس طرح اِس قیادت کا ہر فرد باطل کی بنائی ہوئی شخصیتوں سے کشمکش کر کے اپنی شخصیت کا لوہا منوائے۔ وہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ وہ کسی طاقت سے نہ دَبے۔ وہ کسی قیمت پر نہ بِکے۔ وہ سیرت و کردار میں ممتاز، خدمتِ خلق میں سرگرم، لوگوں کے مسائل میں عوامی ترجمان اور اپنے علاقے میں شجاعت و بہادری کا اعلیٰ نمونہ ہو ایسے افراد ہر انتخابی حلقے، ہر ضلع اور ہر قبیلے میں تیار ہو جائیں جو اسلامی انقلاب کیلئے اپنی دیانت و امانت اور اخلاق و سیرت اور زوردار شخصیت کا لوہا منوائیں۔ جس کے نتیجے میں چند سال کے اندر اندر لوگ ان کے کردار کی مضبوطی اور بلندی کے سبب اُن پر اعتماد کرنے لگیں۔ ان کی خدمتِ خلق کے سبب اُن سے محبت کریں اور اُن کی بہادری کے سبب اُن پر بھروسہ کریں اور بدکار اور غنڈے اُن سے خوف کھائیں۔ ایسے افراد جب کسی تحریک کی دعوت کے ساتھ عوام کے مسائل لے کر کسی علاقے میں اٹھیں گے تو عوام اُن کے ساتھ اٹھیں گے اور وہ جب کوئی رُخ اختیار کریں گے تو عوام کا رُخ بھی اسی سمت ہو جائے گا۔ یہی وہ علاقائی ذیلی قیادت ہے جو ایک اصولی تحریک کو عوامی تحریک بنا سکتی ہے اور ایک محدود تحریک کو عوام کے سیلِ بے پناہ کی رہنما بنا کر کھڑا کر سکتی ہے۔

تحریک اور عوام میں عدمِ رابطہ

ہر قوم اور معاشرے کو اسی کی زبان میں مخاطب کرنے میں ہی حکمت ہے

کہ عوام الناس دعوت کی بات سمجھیں، اس کے دلائل سے آگاہ ہوں، تحریک کے ساتھ شمولیت کے فوائد اور اس سے دور رہنے کے نقصانات سے واقف ہوں۔ اپنے انداز اور اپنے فہم کے مطابق اٹھنے والی تحریک کے خدوخال سے آگاہی حاصل کر کے اس کا ساتھ دیں تاکہ وہ اپنی رضامندی سے تحریک کی دعوت کا جھنڈا اٹھائیں اور اس کے ساتھ شامل ہو کر تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچائیں اور خود بھی تحریک کے ساتھ اس منزل تک پہنچیں، جس پر پہنچنے سے ہی انہیں فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔

جس گروہ کو یہ شعور حاصل ہو کہ اس کی فلاح کسی خاص طرزِ عمل میں ہے تو اس کا اپنی فلاح کی خاطر وہ طرزِ عمل اختیار کرنا بالکل ایک فطری امر ہے۔ اِس طرح مطلوبہ فہم و شعور کے بعد تحریک اور عوام کے درمیان پڑا ہوا عدم آگاہی اور ناواقفیت، شکوک و شبہات اور دُوری کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ تحریک کے پرچم تلے آجاتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ انہیں تحریک سے وابستگی میں اپنی فلاح کا شعور بھی حاصل ہو جائے اور وہ پھر بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں۔

لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ تحریک اور عوام کے درمیان نافہمی کا ایک پردہ حائل رہتا ہے۔ تحریک اپنی دعوت جس انداز سے پیش کرتی ہے، عوام اس سے مانوس نہیں ہوتے جو لغت وہ اظہارِ مدّعا کے لئے استعمال کرتی ہے عوام اُس لغت کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتے۔ جس مقام سے وہ دعوت پیش کرتی ہے، وہ عوام کی سطحِ فہم سے بہت بالا ہوتا ہے اس لئے وہ دعوت کو خالی آنکھوں سے دیکھتے اور نافہم کانوں سے سنتے رہتے ہیں۔ یہی پردہ ہے جسے تحریک اور عوام کے درمیان (COMUNICATION HIIRDLE)

نافہمی یا عدم آگاہی کا پردہ کہا جا سکتا ہے، جسے دُور کیے بغیر عوام الناس کو تحریک کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ مغائرت کا یہ پردہ کارکنوں کی روزمرّہ کی زبان پر اپنے مخصوص مفہوم کی حامل اصطلاحات کا بھی ہو سکتا ہے، انداز بیان اور طرزِ ادا کا بھی ہو سکتا ہے بولی اور لب و لہجہ کا بھی ہو سکتا ہے، لباس، تراش خراش اور رہن سہن کا بھی ہو سکتا ہے، شہری و دیہاتی اور خواندہ اور ناخواندہ کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ خود تحریک اور اس کے مقاصد کے بارے میں مخالفین کی پیدا کردہ غلط فہمیوں، الزام تراشیوں اور بدگمانیوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ ابلاغِ عام کی اس نفسیاتی سدِّراہ کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور ہر صورت تحریک اور عوام کے درمیان حائل ہو کر انہیں باہم قریب ہونے سے روکتی ہے۔

مثلاً تحریک تو عوام کی فلاح کا پروگرام رکھتی ہے اور عوام سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں مجبور و پابند کر دے گی۔ تحریک کی دعوت ان کے رسوم و رواج کے بندھن توڑ کر انہیں سادہ فطری اور ہلکا پھلکا کرنا چاہتی ہے اور انہیں یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ انہیں جکڑ بندیوں سے دوچار کر دے گی۔ تحریک ان کی بنیادی ضروریات تک کا اہتمام کرنا چاہتی ہے اور انہیں گمان ہوتا ہے کہ وہ شاید ان کے بنیادی حقوق کی حفاظت بھی نہ کرے گی اس طرح اپنائیت کے بجائے منافرت، رفاقت کے بجائے عداوت، الفت کے بجائے کدورت اور اُنسیت کے بجائے اجنبیت تحریک اور عوام دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتی۔ یہ نافہمی بالآخر تحریکی صفوں میں بیزاری، چڑچڑاپن اور مایوسی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور تحریک اور معاشرہ دونوں اپنی اپنی جگہ سمٹ اور سکڑ کر رہ جاتے ہیں

اصلاح کے محاذوں کی کثرت

دعوتِ دین ہمیشہ دلوں کو مسخر کرنے والی چیز ہوتی ہے جس کے ذریعہ انقلابی

تحریک اپنے عظیم فلاحی پروگرام کو لے کر آگے بڑھتی ہے۔ معاشرے کا وجود اگرچہ چٹان کی طرح بھاری اور سمندر کی طرح اتھاہ ہوتا ہے لیکن بالآخر تحریک کے انقلابی فکر کے سامنے زیروزبر ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ تحریک ایک ایسی انقلابی قوت کا نام ہے جو فکری اور عملی دونوں میدانوں میں فعّال و سرگرم ہوتی ہے اس میں دریا کی طوفانی لہروں کی مانند بہاؤ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ تحریک کی تھوڑی سی قوت بھی بہت تاثیر اور تغیر کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کی یہی قوت اگر مرکوز ہو کر معاشرے کو اپنی رَو میں بہانے کا کام مسلسل اور پُرزور طریقے سے کرتی رہے، تو وہ کسی پہاڑی نالے کی مثل معاشرے کی چٹیل میدانوں تک پر اثرانداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لیکن اگر نظریاتی اور دعوتی یلغار مختلف مورچوں پر منقسم ہو جائے، تو معاشرے کا بے ہنگم دیو اس تقسیم شدہ قوت کو علیحدہ علیحدہ پاکر اپنے بیشمار بازوؤں میں جکڑنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ جس طرح دریا کو نہروں اور نالیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کے شاہ زور دھارے دم توڑ جاتے ہیں اور جو لہریں بڑے بڑے جہازوں کو اٹھا کر پٹخنے کی صلاحیت رکھتی تھیں وہ نہروں اور نالیوں میں پہنچ کر اپنا سارا بہاؤ اور قوت کھو دیتی ہیں اُسی طرح جب کسی معاشرے میں کوئی تحریک چاہے تدبیر کے طور پر ہی سہی، توازنِ کار کا لحاظ رکھے بغیر اصلاح احوال کے بیشمار مورچوں پر اپنی قوت تقسیم کر دیتی ہے تو معاشرے کی بیشمار آلائشیں اور انجذاب کی قوتیں مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں تحریک کے اندر نفوذ کرنے لگتی ہیں جس سے اس کی انقلابی روح ختم ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ ہر تحریک معاشرے کے مختلف طبقات کو متوجہ کرنے اور سمیٹنے کیلئے مختلف پلیٹ فارم بناتی ہے۔ یہ کام بڑی حکمت و تدبّر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرنے کا

ہوتا ہے، اس لئے کہ مختلف محاذوں سے بہت سی چھوٹی چھوٹی قیادتیں ابھرتی ہیں اور اس میں معاشرے کی بے شمار اجتماعی اور نفسیاتی کمزوریوں کے گھس آنے کا بھی ڈر ہوتا ہے مثلاً قیادت کا چسکا، تحریک کی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کا رجحان اور خود پسندی وغیرہ۔ غرض دریا نالیوں میں بٹتے بٹتے اگر خود ہی خشک ہو کر رہ جائے تو اس صورت میں اس تحریک کا یہ انجام ہوتا ہے کہ ؎

اس موج کی قسمت پر روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ظاہر ہے کہ جب فکری وحدت اور تحریک کے محدود وسائل ایک پُرزور انقلابی جدّوجہد کے بجائے مختلف النّوع مورچوں میں بٹ جائیں تو ایسے دریا کی موج کس طرح ساحلِ مراد تک پہنچ سکے گی۔

اس معاملے کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ اگر کوئی معاشرے کے اندر مختلف محاذوں پر جنگ چھیڑ دے اور وہ جنگ اتنی وسیع الاطراف ہو کہ تحریک عاجز آجائے تو اس کا تشخص (IMAGE) بھی ایک تعمیری قوت کے بجائے ایک تخریبی قوت کا سا بن کر رہ جائے گا حالانکہ یہ تحریک نظامِ غالب کی تمام نوازشات سے محروم ہو کر اور اس کی تمام قہرمانیوں کا نشانہ بن کر ایک دورس انقلابی جدوجہد کر رہی ہوتی ہے اس لئے کسی معاشرے میں ایک تحریک کی حکمتِ عملی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی تھوڑی قوت کو سمیٹ کر کسی ایک نقطے پر اس طرح مرکوز کر کے استعمال کرے کہ اس کے جمہوری، سیاسی اور معاشرتی مثبت نتائج کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکیں۔

غرض جتنے غیر ضروری زیادہ محاذ کھلیں گے، اسی قدر تحریک کی قوت بٹے گی،

CamScanner

اور جس قدر اس کی قوت زیادہ بٹے گی معاشرے میں اس کا مؤثر نفوذ اسی قدر کم ہو جائے گا۔ بلاشبہ اپنی بیش بہا قوتوں کا ضیاع کرنے والی متعدد تحریکوں کے مدفن ہر معاشرے کی گود میں ہی پائے جاتے ہیں۔

عوام میں اسلام سے بے بنیاد خوف زدگی

ایک اسلامی تحریک کا مقصدِ اجرا ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے غالب کرے۔ کافر معاشرے میں ہو تو اس میں سے چُن چُن کر مخلص مومنین کا ایک جتھا بنا کر دین کے غلبے کی کوشش کرے اور اگر کسی نام نہاد مسلمان معاشرے میں ہو تو اس کے افراد میں اسلام کا صحیح فہم و شعور پیدا کر کے انہیں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے مشن پر لگائے۔ اس طرح ایک تحریک عظیم تغیر و انقلاب کی علمبردار بن کر اٹھتی ہے اور وہ جہاں ایک طرف نظامِ غالب کی مطلق العنانی کیلئے ایک مجسم چیلنج ہوتی ہے، وہاں اس معاشرے کے سارے ہی طبقات کو ایک اور بہترین نظام کی طرف لے جانے کی داعی بھی ہوتی ہے۔

اسلام کا حقیقی فہم و شعور پانے والے لوگ تو جانتے ہیں کہ انسانیت کی فلاح و سلامتی کی ضمانت صرف اسلام ہی دیتا ہے، لیکن جو لوگ اسلام کے تاریخی رول سے بے خبر ہوتے ہیں وہ کچھ اپنی بے علمی کے سبب اور کچھ اسلام کے دشمنوں کے بھٹکانے پر، بلاجواز اسلامی نظام کے بارے میں خوفزدگی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ اسی میں عافیت محسوس کرتے ہیں کہ وہ جس حال میں پڑے ہیں، بس اسی حالت میں پڑے رہیں۔ یہ عافیت پسندی بعد میں بے شمار غلط فہمیوں کے ساتھ مل کر بدترین

اندیشوں کا باعث بن جاتی ہے۔ پھر انہیں اسلام میں بندہ و آقا کی مساوات دکھائی نہیں دیتی۔ خدا اور رسول کی رحمتیں نظر نہیں آتیں۔ اسلامی حکومت کے حکام کا گھروں تک خود لوگوں کے حقوق پہنچانے کے اہتمام کا کوئی ادراک نہیں ہوتا۔ انہیں اسلامی نظامِ معیشت میں مسکینوں، بے روزگاروں، قیدیوں، مسافروں، یتیموں، بیواؤں ضعیفوں، بوڑھوں، طالب علموں، بے یار و مددگار حاجتمندوں کی دستگیری کے لئے بے شمار اسباب اور ادارے تو دکھائی نہیں دیتے۔ بس انہیں ہر طرف ہر جگہ اور ہر وقت کوڑے برستے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ گویا اسلامی نظام کے قیام کے بعد سارے جرائم انہیں کے حصے میں آئیں گے، تب انہیں ہر طرف ہاتھ کٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا پشتینی چوروں کے گروہ انہیں کی قیادت میں سرگرم کار رہتے ہیں۔ انہیں اونچے پاجامے اور نیچے کرتوں کا بے بنیاد غم کھا تا رہتا ہے جبکہ اسلام نے لباس کی کوئی تراش اصول ستر کے سوا مقرر نہیں کی ہے انہیں اپنے خوفناک خوابوں میں ڈاڑھیاں ہی لہراتی دکھائی دیتی ہیں، حالانکہ ان کے اپنے بچے ان کے چاروں طرف ہپی اور وحشی بنے پھرتے ہیں۔ انہیں اسلام میں مادی ترقی کے دروازے بند ہوتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اسلام اشرف المخلوقات کے لئے انفس و آفاق کی فتوحات کے دروازے کھولتا ہے۔ کیا اس بات کی تردید ممکن ہے کہ جنہوں نے سچے دل سے اسلام قبول کر کے اس پر عمل کیا تھا، انہوں نے پوری دنیا کی صدیوں تک قیادت کی تھی اور آج کے مسلمانوں کے حصے میں موجودہ پس ماندگی اسلام کے سبب نہیں بلکہ اسلام سے دُوری کے سبب آئی ہے۔

غرض مسلمانوں میں فتنہ و فساد کا علمبردار ایک گروہ اسلام سے خوف زدگی کی

وبا طاعون کے چوہوں کی طرح پھیلاتا رہتا ہے۔ یہ خوف دور کرنا ہر اس انقلابی تحریک کا بنیادی فرض ہوتا ہے جو انہیں اسلام کے لئے اٹھانا اور آگے بڑھانا چاہتی ہے۔

مخالفتوں کا ہجوم

حق کے ایک ہی رُوپ کے سامنے باطل کے سَو رُوپ ہوتے ہیں اور باطل کا ہر روپ حق کو اپنی ہستی کے لئے حقیقی خطرہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ساری قوت سے حق کو دبانے، بدنام کرنے، میدان سے بھگانے اور اسے معاشرے کے عام مسخ شدہ طبقات میں منتشر کرنے کی کوشش میں برابر لگا رہتا ہے۔

جس طرح نظامِ حق کے اپنے خاص سانچے میں ڈھلے ہوئے افراد ہوتے ہیں، اسی طرح نظامِ باطل کے بھی اپنے رنگے ہوئے سپاہی ہوتے ہیں، جو حق کی یلغار کی راہ روکتے ہیں۔ باطل کے اہلِ دل اپنے قلم کو پرورشِ تن و توش کا وسیلہ اور نطق کو شکم پروری کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یہ سب باطل کے محافظ (WATCH DOG) کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ چنانچہ باطل کے اہلِ سیاست، اہلِ حق کو طرح طرح کے نام رکھ کر بدنام کرنے کی مہم چلاتے ہیں۔ باطل کے اربابِ تحریر و تقریر اپنے مخصوص انداز سے اہلِ حق کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے انہیں ننگ بنانے کی سعی ناکام کرتے ہیں۔ ان کی اصطلاحات اور شعار کا خاکہ اڑایا جاتا ہے۔ غیر ملکی طاقتوں سے اس کے رشتے جوڑے جاتے ہیں۔ دوسری طرف علماءِ سُو ان پر گمراہی، بدعقیدگی، اسلاف سے انحراف و گستاخی اور نئی نسلوں کو بگاڑنے کے فتوے لگاتے ہیں۔ اہلِ ثروت و جبروت اپنے زور کے بَل پر حق کا راستہ روکنے کا سامان کرتے ہیں۔ جبر و تشدد کی قوتیں اپنے طوق و سلاسل کے ذریعہ حق پرستوں کے لئے دار و رسن کا بندوبست کرتی ہیں۔

ہر دَور میں دعوتِ حق کے مقابلے میں باطل کی پیروی کے لئے ہمیشہ مختلف طبقات یکساں طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ حسد، عناد، بہتان طرازی اور الزام تراشی کا وہ طوفان سر پر اٹھا دیا جاتا ہے کہ حق پرست چاروں طرف سے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اِن مخالفتوں کے ہجوم میں کارکنوں کی پریشانی بعید از قیاس نہیں ہوتی۔ کچھ ایسی ہی صورتحال تھی جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں کو دعوت و تبلیغ کے لئے بھیجتے ہوئے فرمایا تھا:۔

"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں۔ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کریں گے اور اپنے عبادت خانوں میں تمہیں کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے۔" (متی ۔ ۱۰)

یہ کام ہی ایسا ہے کہ باطل کے پرستار ہاتھ دھو کر اہلِ حق کے پیچھے پڑ جاتے تھے اسی ضمن میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا تھا:۔

"دیکھ بھائی کو بھائی قتل کے لئے حوالے کرے گا بیٹے کو والدین اور اپنے ہی ماں باپ کے خلاف بیٹے کھڑے ہو کر انہیں مروا ڈالیں گے، اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔" (متی ۔ ۲۰ ۔ ۲۱)

ایسے کربناک مخالفانہ ماحول میں حق پرستی اور جرأت مندی ہی کارکنوں کا سرمایۂ تحریک ہوتا ہے۔ ایسے مخالف ماحول میں ہی اسلامی تحریک کے کارکنوں کی ڈھارس بندھانے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اِن کلمات کو ادا کیا تھا۔

CamScanner

"اِن سے نہ ڈرو جو صرف بدن کو قتل کرتے ہیں لیکن روح کو قتل نہیں
کر سکتے۔ صرف اس سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو پیدا کرتا ہے
بس صرف خداوند اپنے خدا سے وابستہ رہو۔"

باطل پرست معاشرے کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرتے ہوئے راہِ حق کے ایک عظیم مجاہد اور شہید حضرت خبیبؓ نے یہ حق کچھ یوں ادا کیا تھا:

"جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں
تو مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔
کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو پر میری جان نکلتی ہے
یہ سب اللہ کی راہ میں ہے
(اس سے بعید نہیں) کہ
وہ چاہے تو ٹکڑے ٹکڑے جسم کے بوسیدہ اعضاء میں پھر سے بالیدگی عطا فرما دے۔"

الغرض مخالفتوں کی یورش سے حوصلہ ہار کر بیٹھنا تحریک اسلامی کے کارکن کو زیب نہیں دیتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مشکلات اس کیلئے لگن اور خلوص کے لیے مہمیز کا کام دیں۔

تحریک اور عوام میں ثقافتی فاصلے

انسانی زندگی کو کسی مخصوص رُخ کی طرف موڑنے والا ہر نظریہ ایک خاص تہذیب کا علمبردار ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں تحریک اور اس سے وابستہ لوگ اپنے ظاہر و باطن میں ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی افتادِ طبع رکھتے ہیں۔ عامۃ الناس تو اپنے

اردگرد کے ماحول، تہذیبی اثرات اور مقامی اور علاقائی خصوصیات سے ہی متاثر ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ وہ انہی عوامل کے حوالے سے کسی سے مانوس ہوتے ہیں اگر تحریک عوام سے فاصلے پر رہنا چاہے تو پھر عامۃ الناس بھی تحریک کی سرگرمیوں میں اپنی بھلائی تلاش کرنے کے بجائے اس سے دُور دُور رہتے ہیں۔ وہ اس کی غرض و غایت معلوم کرنے کا تکلف بھی گوارا نہیں کرتے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ اُن کے حلقے سے باہر کی کوئی مخلوق ہوتی ہے۔ اس طرح تحریک اور عوام کے درمیان ایک غیر مرئی معاشرتی اور تہذیبی خلیج پیدا ہو جاتی ہے جسے پاٹے بغیر تحریک کی دعوت کانوں سے گزر کر دل پر اثر کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ حضور اکرمؐ کی اسلامی تحریک نے عرب کی علاقائی خصوصیات کو زیر و زبر کرنے سے گریز کیا۔ ان کے شعر کا مقابلہ شعر سے اور ان کی زبان دانی کا مقابلہ زباندانی سے کیا۔ عرب کے اہلِ علم کے معیاری ادب پاروں کو چیلنج کر کے تحریک اسلامی نے مقابلتاً بہترین ادب پارے پیش کئے۔ الغرض ان کو نہ صرف ذہنی اور علمی طور پر مرعوب کیا، بلکہ مانوسیت کو راہ دینے کے لئے علاقائی لہجوں میں تلاوت قرآن کو بھی بلا تأمل قبول کر لیا اور قرأت کے سات طریقوں کی گنجائش رکھی گئی۔ اس بات تک کا التزام برتا گیا کہ تبلیغی وفود میں حتی الوسع انہیں قبائل کے مبلغین کو مقرر کیا جائے تاکہ اجنبیت کا شائبہ تک بھی باقی نہ رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ ان کی کسی غلط روش سے بھی صرفِ نظر کیا گیا ہو یا ان کی عصبیتوں کے سیلاب میں بہہ گئے ہوں۔ بلکہ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ایسی بیماریوں کا ہمیشہ ساتھ ساتھ ہی قلع قمع کیا گیا اور اسلام کی صحیح رُوح کے مقابلے میں حائل ہر رُکاوٹ کے لئے تحریک ایک تیغِ بے نیام ثابت ہوئی وہ عوام کی اجنبیت کو اپنائیت سے اور وحشت کو اُنس سے بدلنے کے لئے خصوصی تدابیر

اختیار کرتی ہے۔ مشکل اوقات میں ان کی بے لوث خدمت کرنا بھی دِل جیتنے کا ایک ذریعہ ہے۔ عوام سے پیہم رابطہ رکھنا اور ان سے شخصی تعلقات استوار کرنا بھی بہت مؤثر طریقہ ہے۔ اس کے لئے تحریک کے ذمہ دار کارکنوں کا زیریں سطح پر ہمہ گیر اور مسلسل عوامی رابطہ سب سے زیادہ کارگر ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

انقلابی تحریکوں کے سامنے یہ سوال بلاشبہ بہت اہم رہا ہے کہ اصلاح کی خواہشمند قوموں میں عوام کی اکثریت ہی ناخواندہ ہوتی ہے۔ حضور اکرمؐ نے ایسے ہی خصائص کی حامل قوم کو توحید، رسالت اور آخرت کے اعلیٰ وارفع فلسفے سے روشناس کرایا پھر اُن میں معلّم بن کر سارے عالم کو مسخر کرنے کی جوت جگائی۔ اس لئے انقلابی اصلاح کے راستے میں مجرّد ناخواندگی کوئی حقیقی رکاوٹ نہیں ہے۔ بنیادی طور سے ہر انسان کا دل بھلائی سے متأثر ہوتا ہے۔ اس کا دماغ نیکی کو پسند کرتا ہے اور ضمیر برائی کو ناپسند کرتا ہے اور بھلائی کرنے سے خوش اور مطمئن ہوتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوتی ہے کہ رابطۂ عوام وسیع پیمانے پر پیدا کیا جائے۔ عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے اجتماعی طور پر ایک ہمہ پہلو قابل عمل پروگرام بنایا جائے تاکہ عوامی سطح پر اس پروگرام کو ایک متحرک رَو کی صورت دی جاسکے، کیونکہ اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ عامۃ الناس نفسیاتی اور جذباتی رَو میں بآسانی بہہ جاتے ہیں۔ اس لئے کسی مثبت رُو کا ریلہ ہی پوری قوم کے سوادِ اعظم کو متأثر کرسکتا ہے۔ محض چند تقاریر، کچھ رنگا رنگ پوسٹر اور کچھ پُرہجوم جلسے مطلوبہ متحرک اندرونی رَو (UNDER CURRENT) نہیں اٹھا سکتے اس کے لئے تو بڑی دُور رس پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ تحریک اسلامی معاشرے کے تمام گوشوں کو سیراب کرسکے اور ان کے شعور و فہم میں راستی کی شمع روشن کرکے ذہنی

نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی اندھیاروں کو شکست دے سکے۔ مذکورہ ہمہ جہت جتنا جہد سے تحریکی کارکنوں میں بھی کہولت اور سُست روی کا علاج ہوتا ہے اور وہ نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ ایک طرف تو بُرائیوں کے خلاف برسرپیکار ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی وہ خامیاں دُور ہوتی چلی جاتی ہیں، جو عوام سے دوری کی بناء پر ان میں در آتی ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کی کوتاہ عملی

معاشرے میں علم و فن کے زیور سے آراستہ لوگ ہی اس کے کارپرداز ہوتے ہیں اگر کسی تحریک کو محض خواندہ ہی نہیں واقعی تعلیم یافتہ طبقے کی حمایت حاصل ہو جائے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہے کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ ہی قوم کا دماغ ہوتا ہے جس کے ذریعہ قوم کے مسائل و افکار رُو بہ عمل آتے ہیں۔

معاشرے میں اس طبقے کی اہمیت بجا لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ باطل کی قہرمانی کے سبب یہ کوتاہ عملی کا شکار ہو جاتا ہے۔ تحریک کے لئے عملی جدوجہد تو درکنار اس طبقے کو زبانی حمایت کرنے میں بھی اپنی جان کے لالے پڑے رہتے ہیں۔ کسی مقصد کو جانتے بوجھتے اُس سے یوں بے اعتنائی برتنے کو سخت الفاظ میں منافقت اور نرم الفاظ میں بزدِلی ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ حق پرست انسان تو صرف حق بات کا متلاشی ہوتا ہے اور صحیح ادراک کے بعد وہ اس کی پشت پناہی کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے اور پھر اُسے کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ نظام باطل سے وابستہ مفادات یکلخت ترک کرکے میدان عمل میں کود پڑنا بلاشبہ ایک کٹھن کام ہے تاہم یہ منزل تعلیم یافتہ طبقے کے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتی، وہ حق کی واشگاف حمایت اور سُواء السّبیل

CamScanner

سے انحراف برتنے والوں کے لیے میزان فکر و عمل مہیا کر سکتا ہے۔ ان کا علم و شعور قوم کے کسی کام نہیں آسکتا، اگر وہ قوم کی تعلیم و تربیت کرنے کے بجائے اس کی ہر گمراہی اور بے راہروی کا ساتھ دینے لگ جائیں۔ اُن کی اس کے سوا کوئی راہ نہیں ہوتی کہ یا تو وہ قوم کو راہ راست پر لانے میں تحریک کا کھلا کھلا ساتھ دیں اور یا پھر کجروی کے سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے گمراہی کی پُرپیچ وادی میں بھٹکتے پھریں۔ بلاشبہ وہ علم کسی درجہ سُود مند نہیں ہے، جو راستی کا شعور بخشنے کے بعد جرأت اور بے باکی سے حق کی حمایت کیلئے تیار نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی معاشرے کے تعلیم یافتہ طبقہ میں حق و باطل کے شعوری ادراک کے بعد پھر ساتھ دینے سے پہلوتہی کرنا بڑی بدبختی ہے اور دنیوی مفادات کے نقصان کا خطرہ مول لے کر حق کا ساتھ دینے سے بڑھ کر کوئی سعادت اور خوش بختی نہیں ہے۔ خدا اور بندگانِ خدا کا حق پورے شعور کے ساتھ ادا کرنے والے لوگ تاریخ کے اوراق پر اپنے انقلابی کردار کے اَن مِٹ نقوش ثبت کر دیتے ہیں۔

متبادل سیاسی قیادت کا مسئلہ

عوامی جدوجہد میں منہمک تحریکوں کو عوام کے دلوں کی یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ وہ مقتدر رہنماؤں کے علاوہ متبادل قیادت کے بارے میں کیا احساسات رکھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ محتاط انداز میں یہ معلوم کرنے کی پیہم کوشش کرتے ہیں کہ افقِ اقتدار پر موجود حکمرانوں کی جگہ دوسرا کونسا گروہ لے سکتا ہے پھر جس کا انداز سیاست انہیں یہ اطمینان دلاتا ہے وہ اسی کی طرف لڑھکنے لگتے ہیں۔ حالات کی خصوصی تبدیلی اور

اس گروہ کی حکمتِ عملی کی بدولت بالآخر عوام میں متبادل قیادت کے لئے انہی کا نام لیا جانے لگتا ہے پھر عوام اسی کی طرف لڑھک جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ یہ کسی طلسماتی چھڑی کی بدولت ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے عوام کی ذہنی اور نفسیاتی ضرورتوں کے مطابق تحریک کو مثبت انداز میں آگے لے جانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملک، قوم اور نظامِ مملکت کے لحاظ سے جس نوعیت کے حالات ہوں گے اسی کے مطابق تحریک کی اجتماعی مشاورت اپنا طریق کار طے کرے گی۔ ظاہر ہے کہ انقلاب قیادت یا دوسرے لفظوں میں امانت دار لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل کرنے کے اہم ترین کام میں جمہوری اور عملی قوت کا استعمال ہی کرنا ہوگا۔ بُرے لوگوں کی جگہ نیک لوگوں کو لانے کا کام اصل اسلامی انقلاب کی طرف سب سے عظیم قدم ہے۔ اس کام کیلئے دونوں راستے ممکن ہیں، جمہوری طریقہ بھی اور انقلابی بھی۔ جو تحریک بھی ان دونوں میں سے کسی ایک راستے پر کام کرے اسے بہرحال مختلف مدارج میں سے گزرنا پڑتا ہے تبلیغ، تنظیم، توسیع اور اقدام۔ یہ کام جمہوری جدّوجہد میں انتخابات اور عوامی تائید کے ذریعہ بھی ممکن ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے دَور کی تحریک کے طریقے پر کام کرتے ہوئے عوامی تائید اور اسلامی قوت سے بھی باطل کو زیر کیا جا سکتا ہے۔

اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہونے والے اکثر لوگ عوام کو ہمیشہ یہی تاثر دیتے رہے ہیں کہ ان کی ذات اور اقتدار لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی اُن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ وہ بزعم خود ملک و قوم کی صحیح فلاح کے لیے ایک ناگزیر ضرورت بن جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ قوم، ملک اور اپنے نام کو بھی آپس میں مدغم کر دیتے ہیں تاکہ مَن و تو کا شائبہ نہ ہو پھر ایسی دیدہ دلیری سے خود قوم کو بھی یہی تاثر دیتے ہیں کہ انہیں کرسیٔ اقتدار سے کوئی قوت

CamScanner

بھی نہیں ہٹا سکتی اور اگر کوئی ایسی کوشش کرے تو یہ سراسر تباہی کی بات ہوگی نتیجۃً نہ یہ قوم باقی رہ سکے گی اور نہ ملک سلامت رہ سکے گا۔

برسر اقتدار گروہ کے ہمیشہ بلند بانگ دعووں کے باوجود عوام کی بصیرت کا کلی سودا کبھی نہیں ہو سکتا وہ حکمرانوں کے صحیح مدمقابل گروہوں پر ہمیشہ گہری نگاہ رکھتے ہیں وہ حکمرانوں کے بارے میں اپنی ایک مخصوص اور مختصر لیکن نہایت جامع رائے بھی رکھتے ہیں تاہم ان آراء کے علی الرغم کسی گروہ کو وہ حکومت کی متبادل قیادت سمجھ بیٹھتے ہیں تو پھر اس کی طرف بآسانی لڑھک بھی جاتے ہیں۔ جمہوری معاشرے میں یہ عمل متبادل قوت کو ابھارنے کے لیے ناگزیر ہے اس لیے کسی تحریک کے لئے یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ وہ انقلابی عمل کے ساتھ آگے بڑھتی جائے اور ان قوتوں کا پتہ بھی چلائے کہ کسی اور گروہ کے متبادل قیادت بن جانے کے اسباب و وجوہ کیا ہیں۔ اگر کوئی تحریک اس امر پر نگاہ نہیں رکھتی تو وہ جمہوری ضرورتوں میں سے ایک اہم ترین ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے جس کا خمیازہ اُسے بھگتنا پڑتا ہے۔

اس حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہیں کہ عوام کی اکثریت ایسے گروہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے۔ جو دیانت دار ہونے کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق کی اعلیٰ خصلتوں کا مالک ہو۔ تاہم بعض زور دار اسباب اس گروہ کے آگے آنے میں مانع ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں تحریک کا طرزِ عمل اور اس کی مجبوریاں بھی مقبولیت کے آڑے آتی ہیں چنانچہ عوام ناچار دوسرے کسی ایسے گروہ کی طرف لڑھک جاتے ہیں جو ان کے خیال میں مخالفتوں کو عبور کر کے اپنے زورِ بازو سے متبادل قیادت کی صورت میں ابھرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک ایسے گروہ میں (INITIATIVE) ہوتا ہے۔

متبادل قیادت کا یہی تصور ہے، جو فیصلہ کن مرحلے میں عوام کو ڈھکیل کر ایسے فیصلے کرنے کا محرک بنتا ہے۔ بلاشبہ اس جذباتی اور نفسیاتی رَو میں بہنے کے نتائج بہت تلخ ہوتے ہیں، عوام میں چالباز لوگ یہ تاثر پھیلانے کی باقاعدہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ خدا ترس اور شریف لوگ اقتدار میں آ بھی جائیں تو بگڑے ہوئے افسروں کی مشینری ان کو چار دن بھی چلنے نہیں دے گی۔ بڑے بڑے کارخانے دار اور سرمایہ داران کی اقتصادی پالیسی کو کیسے قبول کریں گے۔ پھر یہ جاگیردار اور وڈیرے تو چند دنوں میں ہی ان کی ساری اصلاحات پر پانی پھیر دیں گے۔ اُن سے تو غنڈے بھی قابو میں نہیں آئیں گے اور نہ ہی چور بازاری کرنے والے ان سے سیدھے ہوں گے، ان شریف لوگوں کو کون چلنے دے گا یہ مایوس کن باتیں اس لیے پھیلائی جاتی ہیں تاکہ عوام راست فکری کے بجائے یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ سیاست اور اقتدار "گندی چیز" ہیں اور اس "گندگی" میں شرافت کا کوئی گزر ممکن نہیں اس کے لیے تو چالبازی، دھوکہ دہی، جھوٹ اور مکر کی صلاحیتیں ہی درکار ہیں۔ اس طرح یہ مکار لوگ تحریکِ اسلامی سے ہمدردی کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح لوگوں کا اعتماد شرافت اور دیانت پر سے اٹھاتے ہیں اور انہیں غنڈوں کی حکومت کو ایک ناگزیر برائی سمجھ کر اُسے قبول کرنے پر آمادہ کرتے ہیں حالانکہ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ عرب کے بدترین قتل و غارت والے ماحول میں بھی جب اسلامی شرافت و شریعت کا قانون نافذ ہوا تو انتہائی مختصر عرصے میں نہ صرف پورا معاشرہ پابند قانون ہو گیا بلکہ اس کی حفاظت کے لیے دست و بازو بھی فراہم ہو گئے۔ معاشرے کی اس رَوش کی بنا پر کجروؤں اور فاسقوں کے لئے دَرست ہو جانے کے سوا اور کوئی دوسرا چارۂ کار نہ تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد جب ملوکیت زدہ دور سے گزر کر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسلامی نظام کا اجراء فرمایا تو صرف چند ماہ میں ہی پورے

معاشرے کی حالت بدل گئی تھی۔ لوگوں کے مابین ایک بار پھر دیانت اور امانت کے چرچے عام ہو گئے۔ اسلامی نظام تو مسلمانوں کو ایک پسندیدہ ماحول میں لے جاتا ہے مسلمان عوام سے بڑھ کر اس کا محافظ کون ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اسلامی نظام کا راستہ روکنے کے لیے باطل اپنی تمام قوتیں صرف کرتا رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی اسلامی تحریک کسی معاشرے میں اٹھتی ہے تو اس کا وجود ہی اس امر پر شاہد ہوتا ہے کہ بدترین حالات پہلے سے موجود ہیں، تاہم خدا کی بندگی کے لیے راہ کشائی کرنی ہوتی ہے۔ تحریک کے کارفرما اہلِ دماغ ہی معاشرے کی تمام مزاحمتوں کا مقابلہ کر کے اپنے اعلیٰ وارفع نصب العین کی جانب بڑھتے ہیں۔ بالآخر ایک وقت آتا ہے کہ مزاحم قوتیں پسپا ہونے لگتی ہیں اور معاشرے کے اکثریتی طبقے بھی تحریک کے لیے سدِ راہ بننے کی بجائے تعاون کی جانب مائل نظر آتے ہیں۔ شاید کچھ ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا تھا کہ حق آیا اور باطل گیا، بیشک باطل جانے کے لیے ہی ہے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا.

مشتبہ امکاناتِ کامیابی

تحریکِ اسلامی کے راستے میں ایک رکاوٹ یہ بھی ہوتی ہے کہ دعوتِ اسلامی کی کامیابی کے بارے میں شکوک وشبہات کا غبار اڑایا جاتا ہے۔ کمالِ خدا ترسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس مادی دور میں اسلامی نظام کی کامیابی کیسے ممکن ہے؟

اگرچہ اللہ کی بندگی انسانی معاشرے کا ایک مستقل رُخ (FEATURE) ہے اور کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ سے سرکشی کا عنصر تو چلے لیکن اللہ کی بندگی کی طرف دعوت

موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دنیا کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ ہاں جو لوگ روشنی دیکھ کر بھی انکار پر ڈٹے رہیں اور آنکھیں نہ کھولیں تو انہیں چمکتے سورج کے وجود کا اقرار کیسے کرایا جا سکتا ہے؟

دعوت الی اللہ کے آغاز کے ساتھ ہی معاشرے کے فعّال سرکش عناصر کی طرف سے مزاحمت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور یوں خالق ومخلوق کے درمیان پردے حائل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مخالفِ اسلام قوتیں اس مرحلے پر یہ حقیقت فراموش کر دیتی ہیں کہ حق ایک کونپل کی مانند ہوتا ہے، جو سخت زمین کا سینہ چیر کر نمودار ہو جاتا ہے اور پھر پھلتا پھولتا ہی رہتا ہے۔ اس لیے کہ دعوتِ اسلامی میں یقینِ محکم اور صلاحیتِ ایمان کی ایسی محرک طاقت کارفرما ہوتی ہے جو کسی ترغیب کے بھرّے میں نہیں آتی اور دباؤ سے دب نہیں سکتی۔ داعیٔ تحریک اپنی دعوت کی شدّت کی بنا پر لوہے سے زیادہ سخت اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط عزم کا حامل انسان ہوتا ہے۔ تاہم جہاں تک اس کے ساتھ مل کر کام کرنے والی ٹیم کا تعلق ہے اس کا مسئلہ داعی سے قدرے مختلف ہوتا ہے دیگر عوامل کے علاوہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کے پاس دعوت دوسرے درجے میں پہنچتی ہے اور اس کے ایثار وقربانی کے ناطے اور تناسب سے ہی اس کا یقین محکم بھی متاثر ہوتا ہے جب کہ تحریک کا داعی حکمت وتدبیر کے نکتۂ نظر سے ساتھیوں کی آزمائش کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آزمائش کی بھٹی میں تیار ہونے والی اینٹوں سے ہی نئے نظام کا قصرِ عالیشان تعمیر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ آزمائش دراصل دعوت کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے اس کے ذریعے وہ قیادت تیار ہوتی ہے جو نئے نظام کی مشینری کو چلاتی ہے۔ جس طرح آزادی کے تحفظ کے لیے قربانی اور جدوجہد

CamScanner

ایک لازمہ ہے۔ اسی طرح آزمائش کے بغیر قیادت اور تحریک کو بھی جلا نہیں ملتی۔

چنانچہ تحریک کی کامیابی کا انحصار داعی کی دعوت سے کہیں زیادہ اس امر پر منحصر ہوتا ہے کہ دعوت پر لبیک کہنے والے لوگ کس تعداد میں آئے ہیں، جو آئے ہیں وہ کس درجے اور پائے کے لوگ ہیں، ان پر آزمائشیں کس نوعیت کی اور کس قدر آئی ہیں۔ ان آزمائشوں میں انہوں نے کیا کردار ادا کیا ہے۔

دعوت الی اللہ کی فطرت میں تو اپنی ماہیت کے لحاظ سے بلاشبہ کامیابی ہی پوشیدہ ہے لیکن پوشیدہ کامیابی کو ظاہر کرنے اور اُسے زمین پر نافذ کرنے میں اس کے ماننے والوں کا بہت غالب حصہ ہوتا ہے۔ یہ لازم نہیں ہے کہ دعوت کو قبول کرنے والا ہر قافلہ کامیابی کی منزل تک پہنچ پائے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس سے بے نیاز ہے کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کی منزل تک کون پہنچتا ہے اور کون نہیں پہنچتا۔ قرآن میں جن انبیاء کرام کا ذکر آتا ہے، ان میں سے بیشتر اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی منزل تک پہنچے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تاہم اُن سب کی امثال قرآنِ پاک نے جگہ بجگہ کامیاب بندوں کی حیثیت سے پیش کی ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے دعوتِ حق پیش کرتے ہوئے انہیں اللہ کی بندگی کی راہ دکھائی۔ تاریخِ دعوت کی طویل ترین مدت بھی قومِ نوحؑ کو راہ راست پر لانے میں کام نہ دے سکی۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ۔ (القمر۔۹)

ان سے پہلے نوحؑ کی قوم انہیں جھٹلا چکی ہے۔ اس نے ہمارے بندے کو جھوٹا کہا۔ دیوانہ کہا اور جھڑک دیا۔

حضرت نوحؑ کے بعد ایک اور معاشرہ قوم عاد کا بھی تھا جس کے سامنے حضرت ہودؑ نے احسن طریقے سے دعوتِ حق پیش کی لیکن ذہنوں پر جب گمراہی کے قفل چڑھے ہوں تو نتیجہ ڈھاک کے تین پات ہی نکلتا ہے۔ ان ظالموں نے بھی اللہ کے راستے اور نبی کے طریقے کی طرف آنے سے صاف انکار کر دیا۔ بالآخر اپنے انجام بد کو پہنچے۔

قَالُوا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ (ھود۔۵۳)

وہ بولے، اے ہود! تم نہیں کسی سند کا حامل نہیں دیکھتے اور نہ ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ ہم تمہاری باتیں تسلیم کرتے ہیں۔

پھر ایک اور معاشرہ حضرت صالحؑ کے زیرِ تبلیغ قوم ثمود کا تھا۔ وہ بھی دعوتِ حق کے مقابلے میں جاہلیت سے چمٹے رہے اور نیست و نابود ہو گئے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝ (ھود۔۶۲)

انہوں نے کہا اے صالح! تجھ سے تو ہمیں پہلے بڑی امیدیں تھیں کیا تو ہمیں ان (بتوں) کی پرستش سے منع کرتا ہے جن کی پرستش ہمارے آباؤ اجداد کرتے رہے ہیں۔ ہم کو تو اس کے بارے میں بہت شبہ ہے جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو ہمارا تو دل نہیں مانتا۔

پھر ایک قوم حضرت ابراہیمؑ کے دورِ نبوت میں تھی ان کا حال یہ تھا کہ جہاں قوم نے ان کے لیے آگ کا آلاؤ تیار کر دیا وہاں ان کے باپ نے انہیں جھڑک کر گھر سے ہی باہر نکال دیا اور ان کی حمایت سے یکسر ہاتھ اٹھا لیا، بلکہ حق کی مخالفت میں دوسروں کے

بھی چند ہاتھ آگے نکل گیا۔

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ۝ (مریم۔ ۴۶)

اے ابراہیمؑ! اگر تو باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر دیا جائے گا اور تو میرے پاس سے دُور ہو جا۔

اسی طرح آزمائشوں کے ذیل میں ایک قوم سے حضرت لوطؑ کو بھی واسطہ پڑا جس کی سرشت میں ہی برائی رچ بس چکی تھی۔ حضرت لوطؑ نے اپنے شب و روز انہیں صراط مستقیم یعنی دینِ حق کی طرف لانے میں صَرف کر دیے لیکن انہوں نے حضرت لوطؑ کی ایک نہ چلنے دی بلکہ ان کی نصیحتوں کا یہ جواب دیا:

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝ (الشعراء۔ ۱۶۷)

اے لوط! اگر تو نے یہ باتیں نہ چھوڑیں تو ہم تجھے اپنے ہاں سے نکال دیں گے!!

پھر حضرت شعیبؑ نے بھی اپنے دَور کے ایک معاشرے اہلِ مَدیَن اور اصحابُ الْاَیکہ کے سامنے دعوتِ حق پیش کی تھی اور انہیں بَدیوں سے نکال کر نیکیوں کی طرف لانا چاہا تھا، لیکن اپنی دعوت کے جواب میں انہیں ظالموں سے دروغ گو کے الفاظ سننے پڑے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (الشعراء۔ ۱۸۵، ۱۸۶)

کہنے لگے (اے شعیب!) تجھ پر تو کسی نے جادو کر دیا ہے وگرنہ تو بھی ہمارے ہی مانند ایک آدمی ہے۔ ہمارے خیال میں تو تو جھوٹا ہے۔

المختصر تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف معاشروں پر مبنی اقوام کے سامنے اسلام کی علمبردار تحریکات "سَواءُ السَّبیل" کی دعوت دیتی رہی ہیں لیکن ان اقوام کی طرف سے بالعموم جاہلیت و گمراہی پر ہی اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ اکثر و بیشتر تو ان قوموں کے سربرآوردہ لوگوں نے ہی دعوتِ حق کی راہ میں رُکاوٹیں کھڑی کیں۔ الزام اور بہتان تراشی ان کا ہمیشہ ہتھیار رہا۔ وہ حسد، مفاد، عصبیت، مفاد پرستی، خود غرضی اور غرور کے شیطانی ہتھکنڈوں کا شکار بن گئے۔ ان قوموں کی اکثریت ہمیشہ دینِ حق سے بے نیاز اور بے رغبت ہی رہی۔ اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی راہ سے وہ بچ کر نکلنا چاہتے تھے۔

اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں جو تحریک اٹھائی گئی تھی، اگرچہ نسلی اعتبار سے اس کے نام لیوا لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ خوب متموّل بھی تھے لیکن اس قوم نے اسلامی انقلاب کو آگے بڑھانے میں سرگرمی تو کجا، حاصلات کا تحفظ بھی گوارا نہ کیا۔ ان سے کہا گیا کہ تم اس مقدس سرزمین فلسطین میں داخل ہو جاؤ جو تمہارے لیے لکھ دی گئی ہے، تو انہوں نے ٹھُڑدلی سے جواب دیا:

يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ (المائدہ۔ ۲۴)

اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں۔ پس تم اور تمہارا رب دونوں وہاں جاؤ اور لڑو ــــ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔

قدیم اقوام و مِلَل کی سرگزشت کے بعد اب اک نظر اس اسلامی تحریک پر ڈالنی بھی ضروری ہے جس کے قائد و ہادی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ غزوہ بدر کے موقعہ پر انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں سہل الحصول قافلہ کے بجائے کفار

کے بھاری لشکر پر حملہ کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ مشاورت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کا انداز بڑا ولولہ انگیز تھا کہنے لگے:

"یارسول اللہؐ! ربِّ ذوالجلال جدھر کا حکم دے رہا ہے، اس طرف چلئے۔ جس طرف بھی آپ جائیں گے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بنی اسرائیل کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ جاؤ تم اور تمہارا خدا دونوں لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ نہیں ہم کہتے ہیں کہ چلیے آپ اور آپ کا خدا دونوں لڑیں اور ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں لڑائیں گے جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے۔"

یہ مہاجرین کے نمائندے کا جواب تھا لیکن جب حضورؐ نے اپنا سوال پھر دہرایا تو حضورؐ کے انصار پر مبنی دوسرے ساتھیوں کا نمائندہ اور ترجمان حضرت سعد بن معاذؓ قوتِ ایمانی کے جذبے سے پکار اٹھا:

"شاید حضورؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے، تو ہم آپ پر ایمان لائے ہیں آپ کی تصدیق کر چکے ہیں کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے۔ ہم آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسولؐ! جو کچھ آپ نے ارادہ فرمایا ہے اُسے کر گزریے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہمیں لے کر سمندر پر جا پہنچیں اور پھر اس میں اتر جائیں تو ہم بھی آپ کا ساتھ دیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ ہمارے لیے یہ ہرگز ناگوار نہیں کہ آپ کل ہمیں لے کر دشمن سے جا بھڑیں۔ (انشاء اللہ) ہم جنگ میں ثابت قدم

رہیں گے۔ مقابلے میں جان نثاری دکھائیں گے اور بعید نہیں کہ اللہ آپ کو ہم سے وہ کچھ نظارہ کرائے جس سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہو۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہمیں لے چلیے۔"[1]

ظاہر ہے کہ جانثاری اور قربانی و ایثار کے اِن والہانہ جذبات کے ساتھ ہی مشکل مرحلوں اور کٹھن حالات میں انقلاب برپا کیا گیا۔ وگرنہ جس تحریک کے ساتھی اپنے مقصد کی لگن سے محروم اور قائد کی کلّی اطاعت سے بے نیاز ہوں، اس تحریک کی کامیابی ایک سراب سے کم نہیں۔ اس کے برعکس اپنے مقصد اور کامرانی کی منزل پر پہنچنے اور اسلامی انقلاب برپا کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت تحریک اسلامی کو نہیں روک سکتی بشرطیکہ اس کے داعی اور کارکن نصب العین کی صحیح روح سے آشنا ہوں۔

٭ ..... ٭ ..... ٭

---

[1] دیباچہ سورۂ انفال تفہیم القرآن جلد دوم

انحطاط کے داخلی اسباب

کسی تحریک میں اضمحلال وجمود پیدا ہوتے چلے جانے کے اسباب صرف اخلاقی اور اصولی ہی نہیں ہوتے بلکہ تنظیمی، اجتماعی اور داخلی بھی ہوتے ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر بھی تحریکوں میں اضمحلال وانحطاط پیدا ہوتا اور بڑھتا چلا جاتا ہے جن میں سے چند ایک اسباب کا تذکرہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

مثالی کردار کی کمی

کسی تحریک کی دعوت کا فہم حاصل کرکے ہی لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں، لیکن ہر داخل ہونے والے میں تحریکی فہم اور جذبہ دونوں چیزیں یکساں نہیں ہوتیں۔ تحریک کی دعوت کا اثر مختلف لوگوں پر مختلف ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے ان میں تحریک اور اس کی دعوت کے لئے سرگرمی، لگن اور ایثار وقربانی کے جذبات بھی یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ آہستہ آہستہ نصب العین کی منزل کی طرف رواں ہوتے ہیں، کچھ تیز تیز چلتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ساری توجہات اور کوششوں اور صلاحیتوں کا محور اسلامی تحریک کو ہی بنا لیتے ہیں اور اپنی خداداد استعداد وانہماک اور فہم وعمل کی یکسوئی سے نصب العین کے راستے پر سرگرمی سے گامزن ہو جاتے ہیں۔ اسلامی تحریک میں انہی غیر یکساں ایمانی کیفیات کو ایمان کے تین مدارج میں بیان کیا گیا ہے

حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَإِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ

(بخاری)

تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اُسے ہاتھ سے روک دے اور اگر یہ اس کے بس سے باہر ہو تو زبان سے اس کی مذمت کرے اور اگر یہ بھی اس کے بس سے باہر ہو تو دل میں اُسے برا سمجھے، تاہم یہ ایمان کی کمزور ترین صورت ہے۔

❊ ❊ ❊

دوسری جگہ اسی بات کو کچھ یوں فرمایا گیا کہ "اس سے نیچے اتنا ایمان بھی نہیں ہے جتنی اُڑد پر سفیدی ہوتی ہے"

گویا نظامِ باطل کے خلاف لڑنے والی داخلی قوت ۔ ایمان ۔ کو تین درجوں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ایمان کی وہ قوت جو برائی کے وجود کو قطعاً برداشت نہیں کرتی اور اسے بزورِ بازو مٹا دینے کا داعیہ رکھتی ہے۔ یہ درجۂ اوّل کی مطلوب قوت ہے۔ یہی قوت صفِ اوّل کے کارکنوں کو باطل کے خلاف جدّوجہد کرنے کے لئے سرگرم رکھتی ہے دعوت کو قبول کرنے والے افراد میں ایمان کی دوسرے درجے کی قوت وہ ہوتی ہے، جو باطل کو دیکھ کر اس سے لڑ جانے اور بزورِ بازو اُسے مٹا دینے کی ہمت تو نہیں رکھتی لیکن باطل کے خلاف زبان کا جہاد ضرور کرتی ہے۔ بلاشبہ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ چنانچہ جابر سلطان کے خلاف اس قوت کے استعمال کو بھی جہادِ کبیر کہا گیا ہے۔ اس سے اسلامی تحریک کی وہ صف تیار ہوتی ہے جو ہمیشہ دعوت کا علم سربلند رکھتی ہے اور صفِ اوّل میں پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد ایمان کا وہ تیسرا درجہ ہے جس میں انسان کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ باطل کی قہرمانی پر اس کا دماغ سوچتا ہے، دل کڑھتا ہے اور

اس کی چبھن دل کی پھانس بنی ہوئی سینے کو جلاتی اور خون کو کھولاتی رہتی ہے۔ یہ ایک کمزور اور سسکتے ہوئے ایمان کی علامت ہے جسے ظاہری طور پر پہچاننا مشکل ہوتا ہے ایسے ایمان والے کارکن کو اگر شبہ ہو کہ نظامِ باطل کے کارندوں کو اس پر تحریکِ اسلامی کا ہمدرد ہونے کا گمان ہے تو وہ بے خبری، بے نیازی، لاتعلقی اور عدم دلچسپی کے کتنے ہی لبادے یکے بعد دیگرے اوڑھ لیتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اُس کا کسی دعوت و تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی توجیہ کے لئے وہ تحریک سے تعلق کو صرف ذہنی وابستگی کا نام دیتا ہے اور اس طرح تحریک کے لئے وہ انقلابی شعلہ نہیں بن پاتا۔

تحریک کی قوت کے مختلف دائرے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کی حقیقی قوت وہی لوگ ہوتے ہیں جو نظامِ باطل سے براہِ راست پنجہ کشی کر رہے ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے اندر بھی محض نظم کے پابند کارکنوں اور دل و جان سے فدا کارکنوں کا فرق موجود ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک کے محسنین یعنی دل و جان کے کارکنوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ دل و جان سے فدا کارکن ہی تحریک کے انجن کا کام دیتے ہیں اور انہی کے کردار اپنے دوسرے ساتھیوں کے لئے نمونے کے مثالی کردار بنتے ہیں۔ انہی کی قربانیوں اور کارناموں کے بیان سے سرد خون گرم ہوتے ہیں، ٹھنڈے جذبات جوش میں آتے ہیں، بند جیبیں انفاق کے لئے کھلتی ہیں اور انہی کا طرزِ عمل تحریکوں کی مضمحل اور منجمد فضا میں گرمی اور تیزروی کا خون دوڑاتا ہے۔ دُنیا کی عظیم ترین اسلامی تحریک کے قائد فرماتے ہیں: "مجھے ہجرت کا حکم ہو گیا ہے، میرے پاس لوگوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں انہیں واپس کرنے کے لئے میرے پیچھے کون میری جگہ میرے بستر پر

آج کی رات سوئے گا؟" وہ بستر جس پر قریش کے شمشیر زن اس رات تلواریں برسانے والے تھے۔ ایک نوجوان موت کے بستر پر اس رات سونے کے لئے بے دھڑک تیار ہو جاتا ہے۔ وہ بستر اس رات تاریخ عزیمت کا تخت ہے۔ وہ نوجوان کہتا ہے کہ اتنی ٹھنڈی اور میٹھی نیند تو مجھے اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی جو اس رات آئی۔ اس کی یہ بات تاریخ کے سینے پر ثبت ہو جاتی ہے۔ وہ کردار تاریخ کا سہرا بن جاتا ہے، وہ کردار مثالی بن جاتا ہے۔ آج ہم کسی اسلامی تحریک کے اندر بڑھتی ہوئی سرد مہری، غفلت، اضمحلال اور انجماد کو اس کردار کی دی ہوئی گرمی سے دور کر سکتے ہیں

احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسلامی تحریک کی حیات و زیست کا مسئلہ درپیش ہے۔ کفر و اسلام کا ایک فیصلہ کن معرکہ سلطنت روم کی سرحد پر برپا ہونے والا ہے۔ تحریک ہر کسی سے ایثار و قربانی کا مطالبہ کر رہی ہے۔ لوگ بلا جھجک حسب المقدور اپنے اپنے مال لئے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی آدھا گھر اٹھا لایا ہے اور کسی نے پورا گھر سمیٹ کر خدا کے لئے تحریک کے دامن میں لا ڈالا ہے اور اس سوال پر کہ اپنے لئے کیا رکھا ہے، یہ جواب ملتا ہے کہ

؎ پروانے کو چراغ تو بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

یہ اخلاص تاریخ کا سرمایہ بن کر دوسروں کے لئے زندگی آموز مثال بن جاتا ہے ایک صاحب جھینپتے شرماتے دامن میں کوئی شے ڈالے چلے آ رہے ہیں تحریک کے عظیم مقصد اور درپیش معرکے میں مالی امداد کے لئے رات بھر ریٹ چلا کر مزدوری کی ہے۔ اب ہاتھوں کے چھالے چھپائے دامن میں تھوڑی سی کھجوریں ڈال کر تحریک کی

مدد کے لئے آئے ہیں۔ اتنے بڑے مال کے ڈھیر کے سامنے کھجوروں کے چند دانے کیا حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان دانوں کی اوٹ میں ایثار و قربانی کا جذبہ و اخلاص اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ بلند کھڑا ہے خواہ کسی کو نظر آئے یا نہ آئے تحریک کے قائد کو تو وہ صاف نظر آ رہا ہے، اور پھر وہی چند چھوہارے پورے ڈھیر پر تحفۂ ایثار قرار دے کر بکھیر دیئے جاتے ہیں یوں وہ شخص بھی تاریخ کا مثالی کردار ٹھہرتا ہے۔

ان مثالی کرداروں سے صدیوں بعد تک لوگ عزیمت و استقامت، جذبہ و توانائی اور حرکت و قوت کا سبق سیکھتے ہیں۔ ایک صاحب تحریک کے لئے اپنے کافر والد سے تلوار لے کر الجھ پڑتے ہیں۔ ایک صاحب تلوار لے کر اپنے کافر بیٹے کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایک صاحب اپنا سارا مال و متاع راہِ حق میں لٹا کر اور دامن جھاڑ سفر ہجرت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک صاحب جو ریشم و کمخواب میں کھیلتے تھے اب جسم پر بوریہ لپیٹے پھرتے ہیں۔ ایک خاتون اپنے جگر پاروں کی شہادت پر شکرِ خدا بجا لا رہی ہیں کہ وہ اللہ کے راستے میں کام آئے اور وہ شہیدوں کی ماں بن گئی۔ ایک صاحب گلیوں میں اذانِ دعوتِ حق بلند کرنے کے جرم میں پتھروں سے زخمی کئے جا رہے ہیں۔ یہ کشمکش حق و باطل کی منجدھار میں جان ہتھیلی پر رکھنے والے محوِ جہاد مثالی لوگ ہیں۔ یہ تاریخی کردار ہیں۔ یہ مثالی کارکن ہیں۔ ان کو دیکھ کر تاریخ میں جان پیدا ہوتی ہے۔ ان کے وجود سے دنیا میں نصب العین سے عشق کا معیار قائم ہوتا ہے اور اس کی محبت کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی کوشش اور مرضی سے تاریخ اپنا دھارا بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ تاریخ انسانیت کا خزانہ، اس کا جوہر اور اس کا سدا بہار اثاثہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کثرت سے ہوں، تو تحریک کی رفتار تیز تر اور اس کی قوتِ جہاد برق

کی مانند تیغ بُراں ہوتی ہے۔ اور اگر مناسب حد تک ہوں، تو تحریک اپنی فطری رفتار سے آگے بڑھتی رہتی ہے۔ البتہ کم ہو جائیں تو تحریک اونگھنے لگتی ہے اور اس کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے۔ یہ لوگ مفقود ہو جائیں تو پھر تحریک کو اضمحلال و انحطاط سے اور اس کی صفوں کو جمود و انجماد سے کوئی شے نہیں بچا سکتی۔ ایسے لوگ تحریک کے ماتھے کا جھومر ہوتے ہیں، اس کی رگوں کا خون حیات ہوتے ہیں۔ انہیں ضائع کر دینا یا انہیں پیچھے پھینک کر خوشامدی، لالچی، خود غرض، بے ضمیر یا ضعیف الایمان لوگوں کو آگے لانا، جیسا کہ اسلامی تاریخ کے دور ملوکیت میں ہوا تحریک کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے اور جو تحریک ایسے ایثار پیشہ، مخلص اور بے لوث کارکنوں سے بے نیاز ہو جاتی ہے تاریخ ایسی تحریک سے بے نیاز ہو جاتی ہے غرض ہر باشعور اور مخلص تحریک کی تاریخ ایسے لوگوں کا انتظار کرتی رہتی ہے اور اگر وہ لوگ نہ آئیں تو تحریک نشانِ عبرت بن کر تاریخ کا غبار بن جاتی ہے۔

پروگراموں کی یکسانیت:

تحریکوں کے لئے یکساں لگے بندھے پروگرام پر مسلسل ایک ہی رفتار سے چلتے چلے جانا بذاتِ خود جمود کا باعث بن جاتا ہے خصوصاً جب سائنس بھی حرکت کے اس یکساں تسلسل کو علامتِ جمود ہی قرار دیتی ہے۔ اجرامِ فلکی اپنی رفتار کی اس یکسانی کے باعث ہی تیز رفتاری کے باوجود ٹھہرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دراصل ایسی حرکت نتیجہ خیز ہونے کے بجائے بتدریج خود مقصد بن کر رہ جاتی ہے اور رفتار کار بڑھانے کے منصوبے بھی کارکنوں کو تیز تر کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور وہ مقصدِ جمود

انحطاط کو ہی پورا کرنے لگتے ہیں یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب تحریک کو اسی انداز سے قائم رکھنا ہی مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس رفتار کا قائم رکھنا بھی درحقیقت ممکن نہیں رہتا اور تحریک ٹھہراؤ کی سمت مسلسل حرکت کرنے لگتی ہے۔ بالآخر اس میں اضمحلال کی علامات نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اب یہ بات ہر تحریک کے چلانے والوں کی اپنی بصیرت پر مبنی ہوتی ہے کہ وہ تحریک کو فعال و بیدار رکھنے کے لئے نئے سے نئے پروگرام بنائیں۔ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے فاصلے کو چھوٹی چھوٹی مسافتوں میں تقسیم کریں اور ان مسافتوں کو طے کرنے کے لئے تحریک کے سامنے چھوٹی چھوٹی مہمات رکھیں اور تحریک کے ڈھانچے کو مختلف ذرائع سے حرکت میں رکھیں۔

اس نوعیت کی منصوبہ بندی کے لئے ہمیں دنیا کی ہر اجتماعی جدوجہد میں مثالیں مل سکتی ہیں لیکن انہیں چھوڑ کر ہم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی دعوت و تحریک پر نظر ڈالیں تو ہمیں اس تحریک میں نہایت عمدہ مثالیں دکھائی دیتی ہیں۔ جسے خالق کائنات کی براہِ راست ہدایت و رہنمائی حاصل تھی۔ مثلاً تین سال کے محدود طریق دعوت کو ترک کر کے اچانک پورے شہر کے لوگوں کو جمع کرنا اور ان کے سامنے ایک خاص انداز میں دعوت پیش کرنا تحریک کی ایک پیش رفت تھی۔ پھر کچھ عرصے بعد ایک پروگرام کے تحت دعوت کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کا گھر بار چھوڑ کر حبشہ کی طرف ہجرت کر جانا اور دور و نزدیک میں اس بات کا چرچا پھیل جانا ایک اور پیش قدمی ثابت ہوئی۔ پھر معراج کے واقعہ کا چرچا اور مجالس میں ہاؤ ہو بھی جاہلی معاشرے کی یکسانی پر ایک اور بڑی ضرب تھی۔ پھر ہجرت کے ذریعہ پوری جماعت کا ایک مورچہ چھوڑ کر دوسرے

مورچے پر چلے جانا اور دشمنوں کے لئے محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا کر دینا تو بلا مبالغہ ایک زبردست انقلابی اقدام تھا۔ پھر تجارتی قافلہ کو چھوڑ کر فوجی کارروائی کا راستہ اختیار کرنا بھی شجاعت و بہادری کا عظیم مثالی کارنامہ ثابت ہوا، جو ربانی ہدایت کے تحت ہی سرانجام پا سکتا تھا۔ اسی طرح شہر کے اندر رہ کر مقابلے کے بجائے کھلے میدان میں زور آزمائی کا فیصلہ بھی اظہارِ قوت کا ایک عمدہ مظاہرہ تھا اور پھر سارے عرب کے امنڈ آنے پر احزاب کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی کامیاب تدابیر بھی حکمتِ کار کا بہترین نمونہ ثابت ہوئیں غرض اس تحریک کی ۲۳ سالہ جدوجہد میں ہم مختلف مواقع پر ایسی ایسی تدابیر کو بروئے کار آتے دیکھتے ہیں جو پوری جماعت کو چوکنا، بیدار، مستعد، چاق و چوبند اور جاں فروش بنانے کے لئے اکسیر کا حکم رکھتی تھیں۔ اسلامی تحریک کے دورِ ثانی میں جب وہ محاذ آرائی کے مورچے پر پہنچ چکی ہے صرف نو سال کے عرصے میں تراسی (۸۳) سے زائد معرکے اور مہمات تاریخ میں درج ہیں۔ ایسے فعال گروہ میں اضمحلال و جمود اور عدم دلچسپی پیدا ہونے کی نہ گنجائش ہے اور نہ اس کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہاں تو حرکت اتنی تیز، کشمکش اتنی جانگسل اور جدوجہد اتنی زور دار ہے کہ کسی کے لئے ٹھہراؤ اور پڑاؤ کی کوئی مہلت ہی نہیں۔ پھر تحریک کی اپنی انفرادیت اتنی بے پایاں ہے کہ اس کے بارے میں محض ایک طالع آزما گروہ ہونے کا گمان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سب سے منفرد، سب سے مختلف اور سب کے لئے واضح لائحہ عمل رکھنے والا ایک جانباز گروہ ہے۔ وہ اپنے نتائج، اپنی جدوجہد ہی سے خود برآمد کرتے ہیں۔ وہ تحریک ایک آکاس بیل کی طرح نہیں جو کسی درخت کا سہارا لے کر کھڑی ہو بلکہ وہ تو ایک تناور درخت ہے جس کے سایے میں صحرانشین اکر دم لیتے ہیں اور قلب و فہم

کی خنکی حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح وہ تحریک اپنے مختلف مراحل کے اعتبار سے آگے بڑھتی ہوئی ایک ایسی سرگرم قوت ہے جو ہر دم تیز تر اور سراپا حرکت ہے۔

اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی تحریک کی بابصیرت قیادت کا سب سے پہلا فریضہ یہی ہوتا ہے کہ وہ تحریک کو جمود و اضمحلال کی ڈگر پر نہ پڑنے دے جس طرح کچے راستے پر چلنے والا چھکڑا اپنی لکیر کا پابند ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر اس کے لئے اس میں سے نکلنا اور اپنی رفتار بڑھانا ممکن نہیں رہتا، اسی طرح اگر کوئی تحریک اپنے ہی بنائے ہوئے روزمرہ کے داخلی پروگراموں میں محبوس ہو کر رہ جائے اور کوئی انقلابی اقدام نہ کر سکے تو اسے اضمحلال کا شکار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

باہمی تعلقات میں سرد مہری

کسی تحریک کے اضمحلال کے بہت سے دیگر اسباب میں سے ایک یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کے کارکنوں میں باہمی تعلقات میں گرم جوشی عنقا ہو جاتی ہے۔ مطلوب اور معیاری چیز تو یہی ہے کہ تعلقات انتہائی خوشگوار ہوں، محبت و الفت اور رفاقت و مودت کا جذبہ تحریکی افراد کو باہم جوڑے ہوئے ہو اور شیطان کو دخل اندازی کا کوئی موقع میسر نہ آئے لیکن یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ کارکنوں میں اگر باہمی غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں جو تعلقات میں سرد مہری پیدا کر کے مزید کھنچاؤ کی راہ ہموار کرے تو اس سے تحریک کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں وہ قوتیں جو باطل کو گرانے اور دشمن کو زیر کرنے پر صرف ہونی چاہئیں وہ باہمی کشمکش میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ تحریک کی بہت سی قوت بکھر جاتی ہے۔

CamScanner

یوں اس کا وقار اور رعب گھٹنے لگتا ہے اور جو کام صرف اس کے نام کے زور سے ہو سکتے تھے۔ اب وہ اس کے وزن اور کوشش سے بھی ہونے مشکل ہو جاتے ہیں اور دشمنوں کی مجلسوں میں اس کا مذاق اُڑنے لگتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں نہ جھگڑو، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اور یوں بھی اللہ تعالیٰ نے اسلامی تحریک کے ساتھیوں کو باہم بھائی بھائی قرار دیا ہے۔ خود حضورؐ نے بھی مختلف مواقع پر اور مختلف پیرائے میں اسلامی تحریک کے ساتھیوں کے درمیان محبت و اُلفت کو ایمان کا جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم اس وقت تک مومن نہ ہو گے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے"

حضورؐ نے اپنی نوباتوں والی حدیث میں بھی اپنے ذاتی طرزِ عمل کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، اور جو مجھ کو حق سے محروم کرے میں اس کا حق اس کو دوں، اور جو میرے اوپر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں"

پھر قرآن نے بھی حضورؐ کے ساتھیوں کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ:

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ "کفار پر سخت اور آپس میں شفیق ہیں"

ان واضح ہدایات کے باوجود انسانی فطرت کی کمزوریوں کے باعث تحریک میں نزاعات رونما ہو سکتی ہیں، کارکنوں میں ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں اور باہم بدمزگیاں انہونی بات نہیں، اور بسا اوقات وہ شدت بھی اختیار کر سکتی ہیں البتہ اگر کارکنوں میں بنیادی طور پر خدا ترسی و حق پرستی اور مقصدِ تحریک کے ساتھ مخلصانہ وابستگی موجود ہو، اس کے علاوہ تحریک کے نظام میں رفعِ نزاعات کا انتظام بھی مؤثر طریقے سے کام کرتا رہے تو کوئی دیرپا خرابی رونما نہیں ہو سکتی اور نہ تحریک کی پیش رفت میں کوئی خلل واقع ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کارکن کبر و نخوت اور نفسانیت میں مبتلا ہوں، مقصدِ تحریک کی بہ نسبت اپنی ذات کو ہی اوّلیت دیتے ہوں اور تنظیم میں بھی رفعِ نزاعات کا کوئی مؤثر انتظام نہ ہو اور مزید برآں کارکنوں کے اندر مقصدی وحدت کو برقرار رکھنے کیلئے اور ایک دوسرے کو قریب لانے کیلئے عملی اور فطری تدابیر اختیار نہ کی جائیں تو ناخوشگوار تعلقات اور باہمی کھنچاؤ کا عمل دخل ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نزاعات سے تحریک کو زبردست نقصان پہنچتا ہے۔

اجتماعی زندگی کے اندر انسانی تعلقات میں ناخوشگواری سے بعض اوقات اتنا بڑا نقصان نہیں پہنچتا جتنا سلجھانے والے عوامل کو بروئے کار نہ لانے سے پہنچ جاتا ہے۔ اصلاحِ ذاتِ البین میں تاخیر اور اس سے بے رُخی معاملات کو اور الجھا دیتی ہے اس سے کشیدگی کے جذباتی زخم مندمل ہونے کی بجائے اور گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں اور تحریک کی قیادت ضابطہ بندی کا شکار ہو کر انسانی نفسیات میں مزید الجھاؤں کا باعث بن جاتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں اگر تحریک کے کارکن بے نفسی سے اور اور اس کے قائدین حکمت سے بہرہ ور ہوں تو وہ نہایت آسانی سے فریقین کے ساتھ

شخصی رابطہ پیدا کر کے اپنے اثر و رسوخ اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو مدّ نظر رکھ کر حکمت و تدبیر کے ذریعہ کشیدگی کو خوشگواری سے بدل دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسانی تعلقات کو جاندار انسانی عمل سے ہی سدھارا جا سکتا ہے بے جان ضابطے سرد مہری اور محض تنظیمی روابط انسانوں کو باندھ تو سکتے ہیں لیکن انہیں جوڑ نہیں سکتے۔ جوڑنے والی چیزیں محبّت و اخوت، مدد و تعاون، دکھ درد میں شرکت، ہمدردی رحم دلی، ایثار و قربانی اور "دل بدست آور کہ حج اکبر است" کا وہ طرز عمل ہے جس میں انسانی قلب و جگر کی حرارت محسوس ہوتی ہو۔ پتھروں کو جوڑنا بلاشبہ مشکل ہوتا ہے لیکن ان انسانوں کو جوڑنا جو خلوصِ قلب اور بے لوثی کے ساتھ ایک نصب العین کی ڈوری سے باہم بندھے ہوئے ہوں، زیادہ مشکل نہیں ہوتا بشرطیکہ خلوصِ نیّت اور ارادہ موجود ہو۔ اگر کسی گروہ کے افراد کی منفی ذہنیت اور تحریک کی قیادت اپنے ساتھیوں میں باہمی تعلقات کی خوشگواری پیدا کرنے اور قائم رکھنے سے بھی قاصر ہو، اور ان کے زخموں کو مندمل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو، تو پھر ہر نزاع ایک دوری اور ہر اختلاف ایک بگاڑ پر منتج ہوتا ہے اور ایسا بدنصیب گروہ بتدریج بگاڑ، انتشار اور اضمحلال کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

قرآن کی بے شمار آیات اور حضورِ اکرمؐ کے بے شمار ارشادات اسلامی اجتماعی زندگی میں تعلقات کی درستی کی تعلیم دیتے اور تعلقات میں ناخوشگواری پیدا کرنے والے عوامل سے روکتے ہیں، ان تعلقات کو تباہ کرنے والی اور سب سے بُری عادت فی الحقیقت غیبت اور چغلخوری ہے۔ کسی کا تمسخر اڑانا اور اس کے بارے میں غلط فہمیاں اور سوءِ ظن پھیلانا ہے۔ بہتان تراشی اور دل آزاری تعلقات کو کاٹنے والی قینچیاں ہیں، افواہ بازی، الزام تراشی

اور ایسے بے سر و پا بہتانات پر یقین کر کے بلا ثبوت انہیں آگے پھیلانا بہت بڑا اجتماعی جرم ہے۔ اجتماعی زندگی میں بعض افراد کے خلاف جتھہ بندی اور نجوی اس اجتماعیت کو تباہ کرنے کے مترادف اور ایک بے غرض، بے لوث اسلامی اجتماعیت کا تقدس برباد کرنے والی کارروائی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات کو سدھارنے والی چیز تحفوں کا باہمی تبادلہ، ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شرکت، ایک دوسرے کی عزت و آبرو کا تحفظ، محبّت و خوش اخلاقی سے باہمی ملاقات اور شکایات کو رفع کرنے کا مؤثر انتظام ہے۔ یہ نہ ہوگا تو لوگ ایک دوسرے سے بدظن اور بد دل ہو کر پھٹتے اور ایک ایک کر کے بیٹھتے چلے جائیں گے اور پوری اجتماعیت بتدریج انتشار و اضمحلال کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ کیونکہ دلوں کا فاصلہ تحریک کی کمزوری کو جنم دیتا ہے۔

قائدین اور کارکنان میں خلیج:

تحریک کے اندر اضمحلال پیدا ہو جانے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ قیادت اور کارکنان کے درمیان خلیج پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک غیر ارادی فاصلہ تو کام کی کثرت، رفقاء کی بہتات اور تحریکی سرگرمیوں کے روز افزوں اضافے کے سبب سے واقع ہوتا ہے اور قائدِ تحریک کا ہر ایک کارکن سے رابطہ و تعلق عملاً ممکن نہیں ہوتا لیکن ایک اور قسم کا فاصلہ ہے جو شخصی تعلقات کی کمی اور قائدین تحریک کے اپنے الگ خول میں بند ہو جانے کے سبب بھی پیدا ہوتا ہے تب بند کمروں کے اجلاس بڑھ جاتے ہیں اور کھلے میدانوں کے اجتماعات سکڑنے لگتے ہیں۔ منصوبے کے کام اور تحریکی جدّ و جہد کا انحصار شخصی اپیل کے بجائے ضابطہ بندی پر منحصر رہ جاتا ہے۔ کارکنان اور قیادت کے درمیان ایک فاصلہ

غیر محسوس انداز میں بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ انہیں احساس سا ہونے لگتا ہے کہ قائدین کے دل اُن سے دُور ہیں اور وہ ان کی آواز سننے سے قاصر ہیں۔ تب ان کے اندر نصب العین سے وابستگی اور طریق کار سے اتفاق کے باوجود وہ دِلی جذبہ و ولولہ باقی نہیں رہ جاتا جو مطلوب ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا رشتہ اپنے قائدین کے ساتھ قلب و روح کا رشتہ نہیں بلکہ محض ضابطہ و کاغذ کی کارروائی بن کر رہ گیا ہے۔ وہ ہر گام پر از خود یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اب تحریک میں ایثار سے مراد صرف کارکنان کا ایثار ہے۔ قربانی سے مراد صرف کارکنان کی قربانی ہے۔ محنت و جدّ و جہد سے مراد صرف کارکنان کی محنت و جدّ و جہد ہے اور پامردی، استقامت اور عزیمت سے مراد صرف کارکنان کی پامردی، بہادری، استقامت اور عزیمت ہے۔ ان کے خیال میں تب تحریکی قیادت اِن امور سے اپنے آپ کو بالاتر رکھ کر سوچتی ہے۔ ایسی حالت میں کارکنان کے دل بجھنے لگتے ہیں اور یہی بجھتے ہوئے دل تحریک کی انقلابی حرارت کو سرد کر دیتے ہیں

انہی شخصی تعلقات کا دوسرا رُخ کارکنوں کے دُکھ سکھ میں شرکت کا عملی مظاہرہ ہے۔ ہر تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد انسان اپنے راستے میں بہت سے موانع پیدا کر لیتا ہے اور اس کی کامیابی سے پہلے پہلے اس کے بہت سے دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اُسے مختلف مواقع پر مشکلات سے دوچار کر دیتے ہیں، نظامِ باطل کا ہر کارندہ اُسے پریشان کرتا ہے۔ پولیس اُسے زِچ کرتی ہے۔ محکمۂ مال اسے مقدمات میں اُلجھاتا ہے۔ علاقائی چودھری اور سرکاری کارندے اس کا ناطقہ بند کرتے ہیں اور تحریک سے وابستگی کے نتیجے میں اُسے ہر ہر قدم پر جہاں بعض سہولتیں ملتی ہیں وہاں بیشمار مزاحمتوں سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ مقدمات کے اُلجھاؤ، قید و بند، بے روزگاری،

کاروباری مشکلات، قرض، اور بیماریاں غرض یہ سب چیزیں اُسے پریشان کر دیتی ہیں۔ اگر اس کی وابستگی کسی توانا اور حساس تحریک سے ہے تو وہ بجا طور پر توقع رکھتا ہے کہ اس کی مشکلات میں اس سے ہمدردی کی جائے گی اور اس کے دُکھ سکھ میں بھی اس کا ساتھ دیا جائے گا لیکن اگر مشکلات میں اُسے کوئی مشورہ بھی دینے کے لئے نہ پہنچے، مدد و رہنمائی تو درکنار، اس کے ساتھی ہی اُسے تنہا چھوڑ دیں کہ وہ خود ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہے، مشکلات میں کوئی اس کی چارہ گری نہ کرے، حُکام سے کشمکش میں کوئی اس کی پشت پر کھڑا نہ ہو، مقامی آویزشوں میں کوئی اس کا دست و بازو نہ بنے، کاروباری تباہی میں کوئی اس کی دست گیری نہ کرے اور نہ پرسانِ حال ہو تو وہ پورے اجتماع میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے اس کا یہ احساس تنہائی اُن سب پر اثر انداز ہوتا ہے جو اس کے اِرد گرد جمع ہوتے ہیں اور اس کی بیچارگی کو دیکھتے ہیں۔ پھر ہر ایک کے دل میں یہی خوف جاگزیں ہو جاتا ہے کہ اگر وہ بھی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوا تو اس کی دستگیری بھی کوئی نہ کرے گا۔ اس طرح کارکنان میں تحریک کی راہ میں آنے والی مشکلات کا جرأت سے مقابلہ کرنے کا جذبہ سرد پڑنے لگتا ہے اور یہی سرد مہری مزید بڑھ کر اِرد گرد پھیل کر تحریک میں اضمحلال و انتشار کا عنوان بن جاتی ہے۔

کارکنان کے ساتھ شخصی تعلقات کی کمی کا تیسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کارکن جو حوادثِ زمانہ کے باعث مشکلات و موانع سے دوچار ہوتے ہیں یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ تحریک کی قیادت اور بااثر افراد جس دریا دِلی سے غیروں پر نوازشیں کرتے اور ان کی تالیفِ قلب کا سامان بہم پہنچاتے ہیں اُتنی ہی سرد مہری اپنے کارکنوں کے

ساتھ برتتے ہیں اور گویا تحریک کا کارکن ہونا ہی عدم توجہی کا باعث ہے اور تحریک سے دُوری ہی توجہ اور التفات کا بظاہر ذریعہ ہے۔ یہ نفسیاتی صورتِ حال اپنائیت کی چاشنی اور حلاوت نہیں رکھتی بلکہ دوری اور اجنبیت کا مزاج اور اثر رکھتی ہے۔

ذاتی محاسبے کا عدم اہتمام:

ایک اخلاقی تحریک کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی صفوں میں اللہ کے حضور جواب دہی کے احساس کی موجودگی ہے۔ یہ احساس جس درجہ میں موجود ہو اُسی درجہ میں معمولی ضوابط بھی مؤثر ثابت ہوتے ہیں اور جس درجہ میں کُند اور غیر فعّال ہو اُسی درجہ میں عام ضوابط تو کیا تعزیر و تادیب کے اقدامات بھی غیر مؤثر ہوتے ہیں۔ ایک اسلامی تحریک میں ہر شخص اس شعور کے بعد شامل ہوتا ہے کہ اُسے اپنے خدا کی خوشنودی مطلوب ہے اور اُسے آخرت میں اپنی ہی کارکردگی اور وفاداری کا اجر و انعام ملے گا۔ اسلام کا عقیدۂ آخرت اور جوابدہی کا صحیح احساس ہی انسان کی اصلاح کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے اندر خود اپنا محاسبہ کرنے کا جذبہ و شعور پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص نے حضورِ اکرمؐ سے سوال کیا:

مَا الْاِیْمَانُ ــــ "ایمان کیا ہے؟"

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ"

"جب تجھے اپنی نیکی پر خوشی ہو اپنی برائی سے تکلیف ہو تو، تو مومن ہے ــــ!"

اس نے پھر عرض کیا "مَا الْاِثْمُ؟ ــ گناہ کیا ہے؟"

حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

"اِذَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ فَدَعْهُ"

"جو کام تیرے دل میں خلش پیدا کرے اُسے چھوڑ دے"

اگر انسان میں ذاتی محاسبے کا شعور ہو، اس کا ضمیر زندہ اور بیدار ہو اس میں خدا کے سامنے جواب دہی کا خوف موجود ہو تو وہ جان بوجھ کر بالارادہ ایسے رضاکارانہ کام سے جو اس کے اپنے خدا کا کام ہے اور اس کام کو کرنے سے اس کی بندگی کا فریضہ ادا ہوتا ہے، کبھی گریز نہ کرے گا اور نہ اس سے پہلو تہی کرے گا۔ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں کام کرنے سے پہلو تہی نہیں کر سکتا اس لئے کہ یہ اس کا اپنا کھیت ہے، جس طرح ایک دوکاندار اپنی دُکان سے بے پروائی نہیں کر سکتا کہ وہ اس کی اپنی دُکان ہے اور اس کا نفع و نقصان کسی دوسرے کا نہیں اس کا اپنا نفع و نقصان ہے، اسی طرح ایک بندۂ مومن خدا کے دین کے کام سے غفلت نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ اس کا اپنا کام ہے اور اس کے بدلے میں اُسے رضائے الٰہی اور آخرت میں جنت ملنی ہے۔

البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ سے سوال کرے کہ وہ اس تحریک سے کیوں وابستہ ہے؟ یا وہ اپنا تجزیہ خود کرے کہ اس کے عقیدۂ اسلام کی نوعیت کیا ہے؟ کیا صرف دماغ نے سمجھ لیا ہے کہ یہ کام معقول اور اچھا ہے یا دل نے بھی مان لیا ہے کہ اسی پر جان و دل نثار کرنا چاہئے؟

خِرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

بعض اوقات انسان کا دماغ ایک بات کو صحیح تسلیم کر لیتا ہے، اس کے

دلائل سے اس کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے اور اُسے اس کی حقانیت پر ذہنی یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دل میں بے یقینی کا بسیرا ہو اور قدم حق کی راہ میں ڈگمگائیں، تو ایسی ذہنی مسلمانی فریضۂ بندگی کا بوجھ نہیں سہہ سکتی۔ کیونکہ جب تک انسان کا نفس مطیع نہ ہو، دل نظریے کا عاشق نہ ہو اور اس کی طبیعت اس کے لئے جان کھپانے میں اطمینان و یکسوئی محسوس نہ کرے، اس سے محض خیالی وابستگی بیکار ہے۔ یہ ضروری ہے کہ کسی تحریک میں مطمئن اور یکسو کارکنوں کی کثرت ہو۔ ان میں ایسے لوگ نہ ہوں جو راستہ بھول کر یا بھٹک کر اِدھر آنکلے ہوں اور ان کی منزل اور منتہائے مقصود کچھ اور ہو، کسی دوسری منزل کا مسافر راستہ بھول کر اِدھر آگیا ہو تو وہ جلد یا بدیر ضرور سمت بدل کر اپنی حقیقی منزل کی طرف چلا جائے گا اور اگر اس کی تربیت و اصلاح کا کام مؤثر نہ ہوا تو وہ سمتِ منزل کی طرف سے بد دل ہوتا چلا جائے گا جس کے نتیجے میں تحریک کے ساتھ آگے بڑھنے کے بجائے تحریک کے اندر تعینِ منزل، سمتِ منزل اور شعورِ منزل کی لاتعداد بحثیں اُٹھ کھڑی ہوں گی اور منزل کی طرف سفر کرنے کے بجائے وہ قافلہ انتشارِ ذہنی اور انفعالیت کا شکار ہونے لگے گا۔

حاصلات میں غیر معمولی تاخیر

کسی تحریک میں اضمحلال آجانے کا ایک یہ بھی سبب ہوتا ہے کہ مطلوبہ نتائج میں تاخیر ہوتی چلی جائے۔ اس سے لوگوں پر تکان اور مایوسی غالب آنے لگتی ہے۔ یہ تکان اور مایوسی تحریک کی صحتِ عامہ کی طرف سے قائدین کی غفلت کے سبب سے بھی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح خاموشی سے تحریک کے اندر پھیلنے لگتی ہے جس طرح ایک بوڑھے آدمی کے جوڑوں میں عمر بھر کا بوجھ درد بن کر اُٹھنے لگتا ہے۔ یہ بھی ایک فطری امر ہوتا ہے اور اس کا تدارک

ایک طرف تحریک میں نئے نئے افراد کی کثرت سے شمولیت کے ذریعہ اور دوسری طرف تاخیرِ نتائج کی عقلی توجیہہ، اجتماعی محاسبے کا اہتمام اور پروگرام میں مناسب اور ناگزیر تبدیلیوں کے لئے بحث و تمحیص کے اہتمام سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ معاملے کا عملی پہلو ہے کہ کارکنان کے سامنے سارے مسائل رکھے جائیں، انہیں کھلی بحث کا موقع دیا جائے۔ انہیں اپنے قائدین کے محاسبے کا خصوصی وقت فراہم کیا جائے، ان کے خیال میں جو کوتاہیاں ہو رہی ہوں انہیں بیان کرنے کی ہمت دلائی جائے اور کام کی بہتری کے لئے ان کے مشوروں کا احترام کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ تو قافلہ کے رہرو ہیں۔ حقیقی ذمہ داری تو ظاہر ہے کہ قافلہ سالار ہی کی شمار ہوتی ہے۔ اگر فتح کا سہرا سالار کے گلے میں ڈالا جاتا ہے تو شکست و ناکامی کی جواب دہی بھی اُسے ہی کرنی چاہیئے۔ اس سے پہلو تہی ممکن نہیں ہوتی، افراد خاموش رہ سکتے ہیں تاریخ تو خاموش نہیں رہتی۔ اس کا فیصلہ تو سب کو خاموشی سے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

اِس کا دوسرا پہلو صبر و حکمت کی کمی بھی ہوتا ہے۔ تحریک اپنے لاؤ لشکر کہیں سے نہیں لاتی۔ اُسے معاشرے میں سے ہی اپنے مطلب کے آدمی چھانٹنے ہوتے ہیں۔ معاشرہ ایک وسیع انسانی سمندر کا نام ہے، اس میں تحریک کا کارکن سمندر میں کھویا ہوا موتی ہوتا ہے جسے بڑی محنت اور غوّاصی سے نکالنا اور اپنے ساتھ شامل کرنا ہوتا ہے، یہ سمندر سے موتی نکالنے کا طویل اور جانگسل کام ہے۔ سمندر اگر موتیوں سے بھرا ہوا ہو تو یہ تحریک کی خوش بختی ہے لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو کامیاب کشمکش کے لیے مطلوبہ تعداد افراد کی فراہمی ایک طویل عمل ہے۔ اس طویل عمل کے لئے صبر اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ صبر اور حکمت کی صفات عام کارکنوں میں کم ہی ہوتی ہیں۔ یہ سکھانے سے ہی آتی ہیں۔ یہ کام

بھی قیادت کا ہی ہوتا ہے کہ کارکنوں میں صبر و حکمت کے اوصاف پیدا کرے جب ایک طرف نتائج میں تاخیر ہو، دوسری طرف اس کی عقلی توجیہہ موجود نہ ہو، تیسری طرف قیادت کا رابطہ کارکنان سے واجبی سا رہ جائے اور چوتھی طرف کارکنان کو صبر و حکمت کی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی مؤثر اہتمام نہ ہو تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ ذہنی بے اطمینانی اور عملی اضمحلال ہے۔

حمیّتِ حق کا زوال:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اجتماعی ماحول میں باطل کے نرغے میں رہتے رہتے اور اس کی باطل اور ظالمانہ تگ و تاز اور کارروائیوں کو انگیز کرتے کرتے تحریک کے اندر حمیّت حق میں کمی واقع ہوتی چلی جاتی ہے۔ حمیّتِ حق اور غیرتِ ایمانی وہ مستقل قیمتی جذبات ہیں جن کی فراوانی سے مومن کے پاس باطل کے خلاف لڑائی کا ایک پورا اسلحہ خانہ تیار رہتا ہے، باطل کے وجود کے خلاف ایک چبھتا ہوا احساس، اس کی ناروا کارگزاریوں کے خلاف جذبات کا بھڑکتا ہوا شعلہ، اس کے ظلم و تشدد پر شدید ردِ عمل، اس کی موجودگی کا غصہ اور اسلامی نظامِ حیات کی غیر موجودگی کا غم، غرض مومن کے ضمیر میں باطل کے خلاف ایک ہمہ وقت ابلنے والا لاوا موجود رہتا ہے جس کی موجودگی سے ہی مومن نظامِ باطل کے خلاف کشمکش میں شعلۂ جوالہ کی مانند گرم و آتش زیر پا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غلبۂ باطل کے تسلسل کے سبب جذبۂ مزاحمت میں کمی آنے لگتی ہے وہ جن چیزوں پر کبھی سراپا احتجاج ہوتا ہے اُن سے بدتر اُمور کو بھی برداشت کرنے سے مزاحمت و احتجاج کے جذبے میں زوال پیدا ہو جاتا ہے اور بالآخر باطل کی پیش قدمیوں

کے مقابلے میں تحریک کے مسلسل برداشت اور چشم پوشی کے رویّے سے تحریک کے اندر چھوٹی برائیوں کی طرف سے مداہنت کی فضا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر چھوٹی برائی ایک بڑی برائی کے مقابلے میں رکھ کر برداشت کر لی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ باطل اپنی حکمت کار سے ہر برائی کو بتدریج چھوٹی برائی بناتا، اور اس سے بڑی برائی کو میدان میں اتارتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جن برائیوں کو کبھی بڑی برائی قرار دے کر ان کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا اور اس سے چھوٹی برائی کو برداشت کیا گیا تھا، بالآخر وہی بڑی برائیاں چھوٹی ہو کر قابلِ برداشت تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ پھر اُن سے بھی بڑی برائیاں میدانِ عمل میں آتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح برائیوں کو برداشت کرنے کا ماحول بتدریج حمیّتِ حق میں کمی کرتا اور مومن کے اندر شعلۂ ایمان کو ضعیف تر کرتا چلا جاتا ہے اور جذبۂ ایمانی کی یہ کمزوری اور پسپائی درحقیقت تحریک کے اندر بے حسی اور اضمحلال کے بڑھتے چلے جانے کی واضح علامت بن جاتی ہے۔

سرمایۂ زندگی لگانے سے گریز:

تحریکوں میں انتشار اور ٹھہراؤ کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں شمولیت اختیار کرنے والے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت تحریک میں زندگانی کا سرمایہ لگانے کی بجائے اُسے ایک جزوقتی کام سمجھ لیتی ہے۔ انسانی زندگی کا سرمایہ مال و دولت نہیں، بلکہ وقت، محنت اور انسانی صلاحیت ہے۔ اسی سے انسانی زندگی کی قدر و قیمت ہے اور اسی کے لگانے سے دنیا میں تعمیر و تخریب و تغیر کا سارا عمل رونما ہوتا ہے۔ وقت سب سے قیمتی سرمایہ ہے جو جہاں لگایا جائے وہاں تعمیرِ وجود میں آتی ہے محنت

سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جو جہاں استعمال کیا جائے وہاں میدان فتح ہوتے ہیں۔ صلاحیت سب سے قیمتی متاع ہے جسے کوئی بھی شخص کسی اجتماعی کام میں ڈال کر اسے مؤثر، بہتر اور کامل بنا سکتا ہے۔ دنیاوی دھندوں میں یہ چیزیں لگا کر لوگ اپنے ذاتی کاروبار چمکا لیتے ہیں۔ اپنے معاشرتی معیار بلند کر لیتے ہیں۔ اپنے مالیاتی مستقبل درست کر لیتے ہیں۔ اپنے بچوں اور وارثوں کے لئے اثاثے تعمیر کر لیتے ہیں لیکن وہ یہ امر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ تحریک خود ایک مالی اور اجتماعی کاروبار ہے جس کی کامیابی سے ساری ملت بلکہ ساری انسانیت فلاح حاصل کرتی ہے۔ تحریک خود ایک معیار ہے۔ جس کے فروغ سے انسانیت کا مطلوبہ معاشرتی معیار بڑھتا ہے۔ تحریک خود تحفظِ افراد کی ایک مالیاتی ضمانت ہے۔ جو اگر کامیاب ہو تو اس کے بیت المال میں ہر ضرورت مند کا حصہ ہوتا ہے اور جس کی کامیابی کے بعد ضرورت مند بتدریج مستغنی اور دولت مند بنتے چلے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جز وقتی کارگزاریوں سے کبھی کوئی میدان فتح نہیں ہوا اور ریزرو فوجوں سے کبھی کوئی غنیم پسپا نہیں ہوا۔ تحریک کی اصل قوت ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنی انسانی بنیادی ضروریات کا اہتمام کرنے کے بعد اپنی ساری صلاحیتیں، قوتیں، اوقات، محنتیں، اور سوچ بچار کی طاقتیں، سب کچھ اُس کام کو آگے بڑھانے پر صرف کر دیں، جو سب کا مشترک کام ہے۔ ان کی اپنی ملت، پوری انسانیت اور اُن کے اپنے خدا کا یہ کام ہے۔ جس کی کامیابی پر دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے۔

اگر کسی تحریک کو ایسے لوگ وافر مل جائیں تو تحریک بڑھتی، پھولتی، پھیلتی، اور فروغ پاتی ہے اور اگر ایسے لوگوں کی کمی ہوتی چلی جائے تو تحریک سمٹتی، سکڑتی اور بجھتی چلی جاتی ہے۔

گروہ بندی کا سرطان :

تحریکوں کو مضمحل کر کے منتشر کر دینے اور پھر انہیں تباہ و برباد اور ہلاک کر دینے کی سب سے بڑی قوت شیطان کی اس تدبیر میں پوشیدہ ہے کہ وہ کسی تحریک کی اجتماعیت میں گروہ بندی پیدا کر دے۔ گروہ بندی ہمیشہ مخصوص مفادات (VESTED INTERESTS) کی بنیاد پر وجود میں آتی ہے اور جب کسی تحریک کی بدبختی اسے اپنا نشانہ بنا لیتی ہے تو وہ مخصوص مفادات کی بناء پر گروہ بندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ویسے تو اسلامی نظامِ جماعت میں نجوی، چغلی، غیبت، گروہ بندی، جتھہ بندی، جانبداری، ہمہ نوعیت عصبیت، سوئے ظن، بے جا طرفداری، بے وجہ مخالفت، حسد، کینہ، بغض اور ریاکاری جیسی قبیح اخلاقی بیماریوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ یہی بیماریاں آگے بڑھ کر گروہ بندی کا سرطان پیدا کرتی ہیں اور اس اخلاقی انحطاط اور ایمانی حادثے سے تحریک کی اجتماعی ہیئت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

مخصوص مفادات کا اشتراک: بعض لوگوں میں مشترک جذبات، رجحانات اور نقطۂ نظر پیدا کر دیتا ہے اور پھر انسان معاملات کو حق و باطل اور خدا ترسی و ناخدا ترسی کے نقطۂ نظر سے سوچنے کی بجائے "میری پارٹی اور میرا جتھہ اور میرا مفاد اور میرا آدمی اور میرا راستہ اور میرا وزن" کے اصول پر جانچنے لگتا ہے۔ پھر اس سے کسی غیر جانبدارانہ اور منصفانہ طرزِ عمل کی توقع ختم ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ایک فریق ہوتا ہے جو اپنی حیثیت منوانے اور اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے ساری حدیں پھاند سکتا ہے۔ دوسرے کے ساتھ وہ سب کچھ کر سکتا ہے، جو اس کی ضرورت کو پوری کر سکتا ہو۔ جو اس کے راستہ میں آئے اُسے ہر تدبیر سے نیچا دکھانے اور اس کا وجود بے رحمی سے ختم کرنے میں پوری

CamScanner

صلاحیت کو کام میں لاتا ہے۔

الغرض ایسی صورت حال کا پیدا ہونا کسی تحریک کیلئے تباہ کن ہوتا ہے۔ ایک جتھے کے مقابلے میں اگر دوسرا جتھہ بنے، تو بات اسی حد تک محدود نہیں رہتی بلکہ جتھہ بندیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور تحریک اپنے مقصد کے لئے کام کرنے کے بجائے اندرونی کشاکش کی آماجگاہ بن جاتی ہے کیونکہ اگر اسی تحریک سے تعلق رکھنے والے دوسرے افراد کوئی جوابی جتھے بندی نہ بھی کریں تب بھی پہلے گروہ کی من مانی کی بنا پر تحریک سے عام کارکنوں کی دلچسپی ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی پیدا ہو، مفادات کی بنا پر جتھہ بندی بہر حال ہر تحریک کے لئے پیغام موت ہوتا ہے۔

عرب کی اوّلین اسلامی تحریک میں جب تک مُسلمان اُمتِ واحدہ بن کر کام کرتے رہے، انہوں نے سارے جہان کو علم و عمل کی روشنی سے منوّر کر دیا۔ مگر جب اُمّت کے اندر جتھہ بندیوں کو راہ ملی تو اجتماعیّت کے تمام اخلاقی جمہوری اور معاشرتی ادارے زوال پذیر ہوتے چلے گئے۔ امّت اور اس کے توسّط سے ساری انسانیت شریف ترین حکمرانوں اور بہترین خادم خلق حکومت سے محروم ہو گئی۔ دنیا کی ہر تحریک جو تباہی کی چٹان سے ٹکراتی ہے اگر اس کے ٹکڑے لے کر ان کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو اس میں گروہ بندی کے ٹائم بم کا تباہ کن بارود ضرور ملے گا۔ کسی تحریک کا جو رہنما اپنی تحریک کو اس ہلاکت آفریں بیماری کے پیدا ہونے کے بعد بھی تباہی سے بچا لیتا ہے اس کو اس تحریک کا مسیحا قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ گروہ بندی کے بعد تو کسی تحریک کی ہلاکت یقینی ہے۔

کسی فکری تحریک کا ایک زوردار اُبھار کے بعد پھر اضمحلال و انتشار کا شکار ہو جانا اور معاشرے کے بیابانِ مرگ میں دفن ہو جانا کوئی انوکھا معاملہ نہیں ہے۔ اکثر تحریکوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے اور وہ انہی اسباب کا شکار ہو جاتی ہیں جن اسباب کو رفع کرنے پر وہ قادر نہیں ہوتیں یا جن کے تدارک کی طرف سے وہ غفلت برتتی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ مطالعہ ہے کہ انقلابی تحریکوں کی تعداد بالعموم معاشرے میں واقع ہونے والی اصلاحات کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ بہت سی تحریکیں سمندر کی موجوں کی طرح اٹھتیں اور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اُن اسباب کا کھوج لگایا جائے جس سے ہر معاشرے میں اٹھنے والی فکری، انقلابی اور عملی تحریکوں کو پہلے انتشار اور پھر جمود کا زنگ لگتا ہے اور بالآخر محض ان کے ناموں اور چند رسمی ہمدردوں کے سوا ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا۔

ایک نظریاتی اسلامی تحریک تو اپنے لئے معیاری کارکن بھی برسہا برس کی مسلسل تربیّت کے بعد تیار کرتی ہے۔ تحریک کے نصب العین سے آگاہی اسلام کے عائد کردہ فرائض کی پابندی اور منکرات سے اجتناب کا تدریجی عمل، کوتاہیوں کو انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے دور کرنے کی پیہم کوشش، بہر حال یہ مراحل تو چند دنوں میں طے نہیں ہو جاتے، اس کے لئے خاصا وقت لگتا ہے اور جس طرح انسان کا تجربہ سونے کی طرح قیمتی ہوتا ہے اسی طرح ہر تحریک میں باشعور پُرانا آدمی بھی سونے سے بڑھ کر قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے ایسے لوگوں کے لئے سابقون الاوّلون کی اصطلاح استعمال کی ہے اور خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حال تو یہ تھا کہ وہ عرب کے بڑے بڑے نومسلم سرداروں کی نسبت تحریک کے پرانے غریب کارکنوں

پر زیادہ توجہ دیا کرتے تھے اور سرداروں سے کہتے تھے کہ جب تم رسولؐ اللہ کی مخالفت کر رہے تھے، تو ان لوگوں نے حضورؐ کا ساتھ دیا تھا اور یہی ان کا سب سے بڑا اعزاز ہے اخلاقی تربیت ہی اِس سرطان کا واحد علاج ہے۔

تازہ دَم نئے کارکنان کی قلّت:

اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ انسانوں پر عمر کا عمل تو لازماً ضعف و اضمحلال بن کر طاری ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر تحریک جس کی جدّوجہد طویل ہو جائے، اپنے بہت سے قیمتی اور سرفروش کارکنوں سے بتدریج محروم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کچھ مَوت کا بازو تھام کر آگے نکل جاتے ہیں اور کچھ عمر کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ اس طرح تحریک کی نہایت قیمتی اور آزمودہ قوّت گھٹتی چلی جاتی ہے لیکن اس زائل ہونے والی قوّت کی کمی وہ تازہ دم، فعّال، چاق و چوبند، جواں سال اور جوش و جذبہ و قوت و توانائی سے معمور کارکن پوری کر دیتے ہیں جو اس تحریک میں تازہ ترین تأثر کے ساتھ نئے داخل ہوتے ہیں جو تحریکی فکر تو اپنے پیش روؤں سے لیتے ہیں اور اپنی قوّت بازو سے عمل کے میدان میں اِس فکر کو کئی گنا آگے بڑھا لیجاتے ہیں۔

پرانے کارکنوں کی درماندگی اور تازہ دم کارکنوں کی قوّت و چستی اور جوش بالکل فطری عوامل ہیں۔ اگرچہ پُرانے کارکنوں نے نئے لوگوں سے بھی زیادہ کٹھن حالات میں بڑی قربانیاں دے کر سرگرمی اور ایثار و اخلاص سے بہت زیادہ کام کیا ہوتا ہے ان کی حیثیّت خاندان کے اس بزرگ کی سی ہوتی ہے جس نے خاندان کی ایک طویل عرصے تک خدمت کر کے اپنا فرض ادا کر دیا ہو اور اب یہ اس گلستاں کی نئی پود کی

ذمّہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس شاداب گلستاں کی شادابی میں مزید اضافہ کرے۔ ہر پرانی نسل نئی نسل کی طرح اپنے وقت میں اپنا پُر مشقّت کام کر چکی ہوتی ہے اور اب اس کی ذمّہ داری کارکنوں کی فکری رہنمائی اور تحریک کے مزاج کو پختگی سے اس کے حقیقی مقام پر قائم رکھنا ہوتا ہے کیونکہ اگر پختہ کار کارکن نہ ہوں تو تحریک کا اپنے مزاج پر قائم رہنا اور اپنی روایات کو قائم رکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کی موجودگی اور فکری رہنمائی اَشد ضروری امر ہوتا ہے اور اسے کسی نسلی خلاء (GENERATION GAP) کے بہانے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بزرگ کارکنوں کی حیثیّت تحریک میں دماغ کی اور نوجوان کارکنوں کی حیثیت تحریک کے ہاتھ پاؤں کی ہوتی ہے لیکن یہ نہایت ضروری ہے کہ تحریک کے جسم کو یہ تازہ دم ہاتھ پاؤں مسلسل میسّر آتے رہیں۔ اگر تحریک نئے کارکنوں سے محروم ہوتی چلی جائے تو اسے ایک نقطۂ اضمحلال و انجماد تک پہنچنے اور بالآخر معاشرے میں جذب ہو جانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

اس لئے تحریک کے ذمّہ دار لوگوں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ تحریک میں چاہے جتنا بھی بلند نظریاتی اور تربیّتی معیار رکھّیں لیکن اس کے حصول میں اتنی شدّت بھی نہ اختیار کریں کہ اُسے صرف عمر رسیدہ کارکن ہی پورا کر سکیں اور اس چھلنی میں سے کئی سالوں کی چھان پھٹک کے بعد جو لوگ تحریک کے معیاری کارکن ثابت ہو کر سامنے آئیں وہ اپنی عمر کا توانائی سے بھرپور حصّہ صحنِ انتظار میں ہی گزار کر مضمحل ہو چکے ہوں اور جب وہ تحریک میں داخل ہوں تو اب ان کے پاس کام نہ کر سکنے کیلئے صرف عذراتِ شرعی ہی باقی رہ گئے ہوں۔

نئے کارکن کیوں نہیں آرہے ہیں؟ یہ سوال ہر تحریک کے اربابِ حل و عقد کے سامنے ہر دم رہنا ضروری ہوتا ہے اور اُن کے لئے تحریک کی ضرورت اور تناسب کے

مطابق نئے کارکن فراہم کرکے آگے لاتے رہنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ جو تحریک بانجھ ہوکر رہ جائے اور اپنی پیری میں سے بھی مطلوبہ کارکنوں کی نئی فصل پیدا نہ کرسکے اُسے موت کے منہ میں جانے سے کوئی قوت بھی نہیں بچا سکتی۔

رضاکارانہ جذبۂ عمل کی کمی:

کوئی انقلابی تحریک کسی تنظیم کے بَل پر ہی چل سکتی ہے جو اس کا لازمی تقاضا سمجھا جاتا ہے۔ ایسی تنظیم تحریک کی روحِ رواں ہوتی ہے، جس میں کام کا جائزہ اور کارکنوں کے اخلاقی معیار اور تحریکی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ سربراہوں کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کام لینے کا فن جانتے ہوں، اربابِ تنظیم کارکنوں کی نفسیات سے واقف ہوں اور ان میں حکم چلانے کی بجائے رضاکارانہ سے کام لینے کی حکمت موجود ہو۔ اس لئے کہ تحریکوں میں سب کام رضاکارانہ ہی ہوتے ہیں اور ملازمانہ ذہن تحریک کو اضمحلال و غفلت اور مداہنت و مصالحت کے سوا کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ کسی تحریک کے ناظمین، جو اوپر سے نیچے تک کام کے ذمہ دار ہوں، وہ خود جانتے ہوں کہ انہیں کیا کام لینا ہے۔ انہیں پورے کام کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کرنے کا فن آتا ہو، پھر حسبِ صلاحیت کارکن ڈیوٹی پر لگانے اور ان سے کام لینے کی حکمت جانتے ہوں، اور پھر کام کا محاسبہ کرنے اور کئے ہوئے کام پر حوصلہ افزائی اور نہ کئے ہوئے کام پر مدد، رہنمائی اور برادرانہ اور رفیقانہ تنبیہہ کا ڈھنگ آتا ہو۔ ان امور میں جس پہلو میں بھی کوئی خامی ہوگی وہ لامحالہ تحریک کی پیش رفت میں حارج ہوگی۔

ایک اسلامی تحریک اللہ کے دین کو بلند کرنے کا عَلَم لے کر اٹھتی ہے، وہ اپنے کارکنوں کو خالصتاً اپنے کام کے لئے وقف کرنا چاہتی ہے۔ جب تک اسلامی تحریک کا مطلوبہ انقلاب نہ آجائے اس کے کارکنوں کو دنیاداری، دنیاسازی اور دنیاطلبی کی کوئی مہلت میسّر نہیں ہے اور نہ دنیا اُن کے لئے کوئی مطلوب و محبوب شے قرار دی گئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ دین کا کام اعلیٰ اور دنیا کا کام ادنیٰ ہے اور یہ دونوں کام برابر نہیں ہوسکتے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ۔

کہہ دو (خدا کی میزان میں) خبیث اور طیب برابر نہیں۔ اگرچہ خبیث کی کثرت تم کو کتنا ہی فریفتہ کیوں نہ کرے، تو اے اہلِ بصیرت! اللہ سے ڈرتے رہو۔

(مائدہ: ۱۰۰)

لیکن اسلامی تحریک کے کارکن اگر تحریک کے کام کو اپنے روزمرّہ کے کاموں کی فہرست میں اس مقام پر لے جائیں کہ جب دوسرا کوئی کام نہ ہو تو پھر یہ کام بھی کرلیا جائے گویا جس طرح دنیا کے دوسرے لوگ اپنے فارغ اوقات مختلف مشغلوں میں گزارتے ہیں اسی طرح تحریک اسلامی کے لوگ بھی صرف اپنے فارغ اوقات میں سے کچھ حصّہ جو اور کسی کام آنے والا نہ ہو وہ اسلامی تحریک کے کام میں دے دیا کریں تو ایسی فراخ دستی اور فراخدلی سے کوئی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا۔ اس طرح تو تحریک کو اضمحلال و انتشار کا شکار ہونے سے بھی نہیں بچایا جاسکتا۔ کسی تحریک کو پورے شعور کے ساتھ اختیار کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک کے لئے اپنی ساری قوتیں اور سارے اوقات تج دینے کا جذبہ لے کر آگے آتے ہیں۔ اگر وہ بھی اُنہی لوگوں کا رویہ اختیار کریں جو ہوں،

CamScanner

نے تحریک سے کوئی تعلقِ خاص پیدا نہیں کیا تو ایسے لوگوں کے بڑے لشکر سے بھی تحریک کے لئے کوئی چھوٹے سے چھوٹا مورچہ فتح نہیں کیا جاسکتا۔

مادّی دَور میں استغراق:

دنیا میں رہتے ہوئے اس کے لوازمات اور ضروریات سے صرفِ نظر ممکن ہے نہ مطلوب۔ لیکن دُنیا ایک پکڑنے والی، گھیرنے والی، اپنے اندر مشغول کرنے والی اور اپنے بے شمار مسائل میں الجھانے والی رزمگاہِ خیر و شر ہے، اس کے کاموں کے بے شمار اطراف ہیں، اس کی ضروریات کے بیشمار شاخسانے ہیں اور اس کے تعلقات کے بے شمار رشتے اور سمتیں ہیں۔ کسی تحریک کا کارکن اِسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے، جس میں تحریک بھی چلتی ہے، تحریک کا مقصد بھی اِسی دنیا کے بعض اُمور کو ایک رُخ سے ہٹا کر دوسرے رُخ پر ڈالنا ہوتا ہے، اس لئے ترکِ دنیا کسی انقلابی تحریک کے لئے قطعاً مقصود نہیں ہوتا۔ لیکن تحریک کا مقصد خود اپنے لئے بہت سا وقت طلب کرتا ہے، بہت سی صلاحیتیں مانگتا ہے۔ بہت سے افراد کی زندگیوں کو اپنے لئے وقف کرنا چاہتا ہے اور اُن سے بہت سے دوسرے اشغال چھڑا کر اُنہیں خالص اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ کسی تحریک سے پورے شعور سے وابستہ ہوتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ذمہ ایک ایسا کام لیا ہے جو اُن سے دوسرے بہت سے کام چھڑا کر اُن کی تمام تر توجہات اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے تحریکیں بے دِلی یا نیم دِلی سے نہیں چلائی جاسکتیں اور نہ انہیں اس کیفیت کے ساتھ کامیابی کے کسی کنارے تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

نظریہ اور کاروبار:

بعض اوقات کسی تحریک سے وابستگی کا نہایت پرجوش جذباتی دھارا کسی شخص میں محض اس لئے رُک جاتا ہے کہ تحریک سے وابستگی کے بعد اچانک معاشی اور کاروباری ضربیں لگنے لگتی ہیں۔ تحریک کے مخالفین اور خود باطل نظام بھی تحریک کے کارکنوں کی معاشی ریڑھ کی ہڈی پر ضرب لگاتا ہے۔ تاہم تحریکوں کے انقلابی کارکنوں کے لئے یہ تو معمول کی بات ہے، وہ چلتے کاروبار بیٹھ جانے دیا کرتے ہیں اور بڑی بڑی تجارتیں سمیٹ کر بازارِ عشق کی خاطر اپنی دکان بڑھا دیا کرتے ہیں۔ وہ حکم ملنے پر ملک چھوڑ کر پردیس کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ حقیقی خسارہ مال و دولت اور کاروبار کا نہیں بلکہ ایمان، عملِ صالح اور دینِ حق کی نصیحت و تبلیغ میں کوتاہی کا خسارہ ہے۔

وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (العصر)

زمانہ گواہ ہے کہ انسان خسارے میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کئے اور جو ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہے۔

غرض جو لوگ دنیا کے خساروں کو گننے بیٹھ جاتے ہیں اور ان سے بچنے کے لئے اور زیادہ انہماک سے دنیا میں مشغول ہو جاتے ہیں، وہ دین کا کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کر سکتے اور ان کے ہاتھوں کوئی تحریک کامیاب تو کیا ہوگی زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ ایسے کارکنوں کی اگر تحریک میں کثرت ہو جائے تو وہ تحریک مفاداتِ باہمی کی انجمن بن کر رہ جاتی ہے اور کوئی انقلابی کام کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ معاشی جھٹکوں کے نتیجے

CamScanner

میں خسارے کا دوسرا پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اقتصادی مار کھائے ہوئے خستہ حال کارکنوں کی تحریک میں اتنی کثرت ہو جاتی ہے کہ وہ تحریک کیلئے قابلِ ذکر خدمات سرانجام دینے سے معذور ہو جاتے ہیں اور تحریک آگے بڑھنے کے بجائے پریشان حال لوگوں کا گروہ بن کر رہ جاتی ہے۔ پریشان حال لوگ بلاشبہ بڑے انقلابی لوگ ہوتے ہیں لیکن زیادہ پریشان حالی آدمی کی قوتِ کار اور صلاحیتِ فکر کو سلب بھی کر لیتی ہے۔

مشکلات سے فرار کا رجحان:

ہر تحریک کو مزاحمتوں سے واسطہ پیش آتا ہی ہے لیکن اسلامی تحریک تو دنیا بھر کی مشکلات و مصائب سے دوچار ہوتی ہے۔ گالی گلوچ، بہتان تراشی اور جھوٹ کے طوفانوں سے لے کر قید و بند اور دار و رسن تک ہر طرح کے مراحل سامنے آجاتے ہیں۔ جن لوگوں سے بھی مخالفانہ سابقہ پیش آتا ہے، وہ اخلاقی حدود کی ہر نوعیت سے آزاد اور ناآشنا ہوتے ہیں، ظالم، تشدد پسند اور ناجائز ہتھکنڈوں کے استعمال میں تحریک کے داعی اور کارکن اگر پورے فہم اور عزم کے ساتھ اس وادی میں آئے ہوں، تو وہ پہلے سے ہی ان سب باتوں کو قرآن کی رہنمائی اور اسلامی تحریکوں کی تاریخ سے آگاہی کے سبب جانتے اور اس کے لئے ذہناً اور عملاً تیار ہوتے ہیں۔ لیکن بعض حالات میں پُرعزیمت افراد کی کمی، مثالی کارکنوں کی کمی اور مشکلات و مصائب کا ہجوم کارکنوں اور قیادت دونوں میں آزمائش و مشکلات سے ہر بار بچ نکلنے کا رجحان پیدا کر دیتا ہے، اپنی قوت اور حالات کی سختی دونوں کے بارے میں منفعلانہ غلط تخمینہ اقدامات میں لچک پیدا کر دیتا ہے جس سے بچ نکلنا اور تحریک کی قوت کو محفوظ کر کے

کسی بہتر اور مناسب موقعہ پر صرف کرنا حکمتِ کار کا تقاضا سمجھ لیا جاتا ہے لیکن جو لوگ تحریکیں چلاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کبھی بچ کر نکل جانا وقت اور تحریک کی ضرورت ہوتا ہے اور کبھی ٹکرانا اور کشمکش کرنا بھی وقت اور تحریک کا ہی تقاضا ہوتا ہے کبھی ساحل پر تدبیرِ منزل کی جاتی ہے اور کبھی موجوں سے کشمکش کر کے منزل کا راستہ بنایا جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں تحریک کی ضرورت ہوتی ہیں۔ ہمیشہ بچ نکلنا اور اسی کو مستقل روش بنا لینا اسلامی تحریک کے مزاج کے منافی کبھی کبھی غفلت اور تساہل کا راستہ بن جاتا ہے فوجیں کبھی جنگ کرتی ہیں اور کبھی جنگ کی مشق کرتی ہیں اور ان دونوں صورتوں میں وہ برسرِ پیکار ہی ہوتی ہیں تاکہ جوانوں کا خون گرم رہے اور کارکن آگاہ رہیں کہ ہم میدانِ جنگ میں ہیں۔ ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا،
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

اور ظاہر ہے کہ تحریکوں کا لہو گرم رکھنا ان کی فعالیت اور زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کارکنوں کا لہو اگر گرم نہ رکھا جائے تو وہ سرد ہو جاتا ہے اور جب کارکنوں کا لہو سرد ہو جائے تو تحریک میں اضمحلال کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن بعض اوقات کسی تحریک کے قائدین اور دیگر اہل الرائے حضرات میں، جن کے ہاتھ میں تحریک کی باگ ڈور ہوتی ہے، مشکلات و مصائب کی کثرت کے سبب ان میں گریز کا غیر محسوس رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان میں قید و بند سے بچنے کی غیر محسوس خواہش داخل ہو جاتی ہے، جسے ان کا ذہن تحریک کی ضرورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ باطل کے علمبرداروں کی طرف سے جب دھمکی، دھونس اور دشنام کا سلسلہ

CamScanner

زیادہ شدت اختیار کرتا ہے، تو تحریک کے مفاد میں ہی تحریک کو تباہی سے بچانے کے خیال سے رابطۂ عوام سے گریز کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ پھر امورِ تحریک کو چلانے میں مصلحت پسندی کا رجحان اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ مخالف کو مشتعل کر کے حملہ آور کرنے سے بچنا خود تحریک کی اپنی ضرورت سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ باطل تو دشنام دھمکی اور دھونس کا استعمال اِسی لئے کر رہا ہوتا ہے کہ تحریک کو عوامی رابطے اور نفوذ سے دور رکھا جائے لیکن تحریک کی طویل جدّوجہد، غیر مؤثر تدابیر کی مسلسل ناکامی اور مشکلات کی کثرت کے سبب تحریکی سرگرمیوں کو تیز تر رکھنا بھی خلافِ مصلحت محسوس کیا جانے لگتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جدوجہد کی تکان اور مسلسل ناکامی آدمی کو تھکا دیتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ بے انتہا تحریکی مصروفیات، شب و روز کا سفر، راتوں کو جاگنا، مسلسل بے آرامی، بیوی بچوں سے دوری، ان کی نگہداشت اور تربیت سے معذوری، یہ سب باتیں ذمہ دار کارکنوں کو بھی کھلنے لگتی ہے اور تحریک کا دھارا سنگلاخ پہاڑوں کی انقلابی چٹانوں سے نکل کر میدانوں کی پرسکون وادی کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ اسلامی تحریک کے کارکن اور قائد اگر مشکلات سے گریز کرنے لگیں، اگر انہیں باطل کی سختیاں پریشان اور آزردہ کرنے لگیں، اگر انہیں باطل کے خلاف جدوجہد کی ذمہ داری بارِ گراں محسوس ہونے لگے اور ان کے لئے تحریک کو وادیٔ کشمکش میں تن تنہا چلانا دشوار ہو جائے اور وہ سہارے ڈھونڈنے لگیں یا آزمائشوں سے غیر محسوس انداز میں فرار کی کیفیت اپنے اندر پرورش کرنے لگیں تو پھر تحریک کو اضمحلال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

مشکلات و مصائب سے قطعِ نظر، بعض اوقات بلاجواز سہولت پسندی بھی

آزمائشوں سے گریز کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ بلاشبہ آزمائش کوئی مطلوب شے ہرگز نہیں اور نہ اسے بلانے کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جس طرح ایک ذہین انسان مشکل سے مشکل سوال کو حل کرنے سے ایک پُرمسرت کیفیت محسوس کرتا ہے، اسی طرح تحریک کا ایک جان نثار کارکن بھی بعض اوقات محض تحریک کے وقار اور مفاد کی خاطر آزمائش کو شرحِ صدر سے قبول کرتا ہے اور اس سے گریز کو اپنے مقصد اور نصب العین کے وقار کے منافی سمجھتا ہے۔ آزمائشیں تحریکوں کو نکھار دیتی ہیں، اس کے کارکنوں میں کھرے کھوٹے کی پرکھ کر کے چھانٹ دیتی ہیں۔ مخالفین کی نظر میں تحریک کے وزن کو بڑھانے میں بھی آزمائش مدد دیتی ہے۔ اس کے ہمدردوں کی صف کو وسیع کرنے اور کارکنوں کی رگوں میں لہو کو تیز تر کر کے ان میں قوتِ کار، قوتِ جہاد اور قوتِ پیکار کو بڑھانے میں آزمائش اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ حضور اکرمؐ کی مقدس اسلامی تحریک نے آگے بڑھ کر ان آزمائشوں کو سینے سے لگایا جو ان کا کردار نکھارنے کا باعث ثابت ہوئیں۔

فرار کے رجحان کا ایک اور پہلو انسان کے گرد اس کے ہمدردوں کا وہ دائرہ ہے جو اس کے مفاد کو دنیوی نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اپنے طور پر اس کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے بیوی بچوں کا دباؤ، ان کے دوست احباب کے تقاضے اور ان کے اہلِ خاندان کا گھیراؤ کہ وہ اپنے آپ کو کس کھکھیڑ میں ڈال رہے ہیں اور اس کھکھیڑ میں پڑنے سے کیا کیا کچھ ہولناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ تحریک کے یہ بزعم خود بہی خواہ کارکنوں کے کانوں میں ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر لحظہ ان کے نفع و نقصان ان کے حال اور مستقبل اور ان کے آغاز و انجام کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور انہیں اس راستے کی ہولناکیوں سے دہلاتے رہتے ہیں۔ اگر تحریک کے کارکن اور قائدین اس نفسیاتی گھیراؤ سے متاثر ہونے لگیں

تو پھر تحریک کی رگوں میں خون جمنے لگتا ہے۔

بلاجواز خوف وہراس:

انقلابی تحریکیں ہمیشہ کسی نہ کسی چیلنج کا جواب بن کر بپا ہوتی ہیں اور وہ خود بھی کوئی چیلنج لے کر اُبھرتی ہیں۔ ایک نظریاتی وانقلابی تحریک کے رگ وریشے میں خوف وہراس کا دخل نہیں ہوتا، بلکہ اس کی اٹھان ہی بعض حقائق کو بزور منوانے کے تصوّر پر مبنی ہوتی ہے۔ ایک نظریاتی تحریک کسی آکاس بیل کی طرح سہاروں کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک تناور درخت کی طرح اپنے بل بوتے، اپنے تنظیمی ڈھانچے اور اپنے نصب العین کے تنے پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس کے طلوع سے مخصوص مفادات کے حامل لوگوں پر تو خوف وہراس کی زردی طاری ہوسکتی ہے لیکن اس کی اپنی شعاعیں خوف وہراس کے گرد وغبار سے پاک ہوتی ہیں۔ اس سے وابستہ ہونے والے اپنی سرفروشی کی بنا پر دھارے کے خلاف تیرنے کا عزم لے کر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اُن سے پہلے زمانہ کیا کچھ کرتا رہا ہے، وہ اس سے آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ پورے شعور کے ساتھ ایک عظیم تر مقصدِ زندگی کی خاطر میدانِ دعوت وعزیمت میں قدم رکھتے ہیں۔ فی الحقیقت ایسے لوگ خدا کے سوا کبھی کسی سے نہیں ڈرتے۔ وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی یہ کہہ کر بیٹھنے سے انکار کردیتے ہیں کہ "میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہ جائے گا"[1]۔ انقلابی تحریکوں کے داعی باطل پرستوں کے آگے نہیں جھکتے اور جان بچانے کے لئے ظالموں کے سامنے اپیلیں کرنے کے بجائے پھانسی کے پھندے کو چومنا بہتر گردانتے ہیں۔

[1] جماعت اسلامی کے اجتماع ۱۹۶۳ء میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا تاریخ ساز اعلان

وہ سید قطبؒ کی طرح ظالم کی عدالت میں جاکر بھی یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ "میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر لایا ہوں"۔

تحریک کے درخت میں خوف وہراس کے پھل نہیں لگتے لیکن کبھی کبھی شاطر حکمراں اجتماعی ماحول میں خوف وہراس کو راہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ تحریکی قائدین کے قریبی بے گناہ لوگوں کی پکڑ دھکڑ کرتے ہیں یا ایک قدم آگے جاکر چند معصوم جانوں کو بے گناہ ہلاک کردیتے ہیں تاکہ اپنے اختیار کی حدود کے احساس کے ساتھ ہی خوف ودہشت کے جذبات پیدا کرسکیں۔ اس ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے دعوائے خدائی کے "عملی اظہار" کے لئے نمرود کے ایک بے گناہ کی جان لینے کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

گویا اس طرح تحریک کے اندرونی حلقوں کے علاوہ اس کے نظامِ اعصاب کے اِرد گرد دہشت ناک فضا پیدا کی جاتی ہے اور کمزور افراد کو سنسنی خیز انداز میں ایک مستقل اعصابی جنگ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں کے ذریعے نظام باطل کے علمبرداروں کے "خوفناک عزائم" کی باتیں سرگوشیوں کے انداز میں پھیلنے لگتی ہیں اور دہشت وبے یقینی کی فضا پیدا ہونے لگتی ہے۔ یاد رہے کہ خوف وہراس کی یہ رَو ہمیشہ اوپر سے نیچے کی طرف سفر کرتی ہے، کیونکہ مرکزِ اعصاب کو جکڑ لینے کے بعد تحریک کا پورا جسم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لئے کہ جب کسی تحریک میں اسکا اپنا پروگرام، فیصلہ اور اقدام ثانوی حیثیت اختیار کرجائے اور غیر فطری احتیاط کے روپ میں خوف زدگی کی فضا بن جائے تو تحریک کا پورا وجود معطل ہوکر رہ جاتا ہے، بلاشبہ جس طرح خوف زدہ آدمی کوئی تعمیری کام نہیں کرسکتا، اسی طرح خوفزدگی کی شکار کوئی

تحریک بھی کوئی مثبت کام نہیں کرسکتی اور پھر یہ فضا اگر زیادہ دنوں تک کسی تحریک پر محیط رہے تو اس تحریک کو غیر فعالیت اور جمود سے کوئی شے نہیں بچا سکتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں ایسے ہی چند سال گزارے کہ کفار کی دہشت وخوف کی شیطانی قوتیں عروج پر تھیں۔ اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ہتھیار نہ ڈالے۔ آپ اپنی دعوت کو نہ صرف جرأت سے پیش کرتے رہے بلکہ ہمیشہ اپنے ساتھیوں کو سہارا دیتے رہے۔ صحابہؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی گھمسان کا رَن پڑتا تھا تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ لیا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ خوف وہراس کی ایسی فضا بھی کسی تحریک کے لئے ایک نوعیت کی آزمائش ہی ہوتی ہے، جس سے عہدہ برآ ہونا تحریک کے قائدین کا اوّلین فرض ہوتا ہے۔ بہرحال باطل کی اس منفی مہم کو تحریک کی بلند آہنگ دعوت اور اس کے جرأت مندانہ اقدامات ہی ختم کرسکتے ہیں۔ ورنہ وہ تحریک سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

مثبت پروگرام کا فقدان:

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نظریاتی تحریک چلتے چلاتے ایک ایسے مقام پر آجاتی ہے، جب اس میں محض روزمرّہ کے تنظیمی پروگرام ہی رہ جاتے ہیں اور اس کے کارکنوں کے سامنے ایسا کوئی انقلابی پروگرام نہیں رہ جاتا، جو تحریک کی پیش رفت کی علامت ہو۔ اگرچہ ضرورت ایسے مثبت اور انقلابی پروگرام کی ہوتی ہے جس سے اس تحریک کے کارکن اپنے آپ کو آگے کی طرف بڑھتا ہوا محسوس کریں۔ ایسا انداز رُو بہ عمل آنا ضروری ہوتا ہے جو تحریک کے وجود کا اس معاشرے میں صحیح وزن محسوس کرائے

اور اس کا وجود اسی نوعیت کی دیگر تحریکوں سے ممیز اور ممتاز بنا سکے۔ درحقیقت کوئی پروگرام ہی کسی تحریک کے لئے پٹری کا کام دیتا ہے جس پر اس کی نظریاتی گاڑی چلتی ہے۔

مثبت پروگرام کی عدم موجودگی کی صورت میں ایک تحریک روزمرّہ کے کم اہم پروگراموں میں الجھ جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ ایسے کاموں میں الجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے جن کو پہلے فروعی کام قرار دے کر نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی وہ انہی لوگوں کی ہمرکاب دکھائی دینے لگتی ہے جن کو پہلے کسی اور منزل کے راہی قرار دے کر وہ ان سے صَرفِ نظر کرچکی تھی، پھر وہ انہی مسائل کو اٹھاتی ہے جو پہلے اس کی نظر میں غلبۂ دعوت کے بعد خود بخود حل ہو جانے والے تھے۔ ایک مُبصر جو اس تحریک کو بہ غائر نظر دیکھتا چلا آرہا ہو یوں محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ اپنی منزل کو بھول گئی ہے یا اپنی منزل کے حقیقی پروگرام سے ہٹ کر بہت زیادہ غیر متعلق مسائل میں اُلجھ گئی ہے جیسے کوئی شخص اقامتِ صلوٰۃ کے لئے اذان دے کر نمازیوں کو جمع کرنے نکلے اور باہر جاکر لوگوں کی خدمت کے دوسرے کاموں میں ہی گم ہو کر رہ جائے۔

حضور اکرمؐ نے دعوتِ اسلامی میں توحید کے غلبہ کا پروگرام ہر چیز پر غالب رکھا اور اس پر کسی سے مصالحت نہیں کی البتہ اسلام کے غلبے کے لئے مسلسل پیش قدمی جاری رکھی اور زندگی کی مصروف ترین ہمہ جہتی جدّوجہد کی لیکن کسی کو کبھی بھی پروگرام کے فقدان کا احساس نہیں ہوا کیونکہ دینِ متین کے غلبہ کا واضح پروگرام موجود تھا۔

ظاہر ہے کہ جو لوگ کسی خاص پروگرام کی خاطر ہی کسی تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں وہ اس پروگرام سے بہت زیادہ غیر متعلق سرگرمیوں میں بہت زیادہ عرصہ تک یکساں دلچسپیاں برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بتدریج ان کی دلچسپیاں کم ہونے لگتی ہیں۔ انہیں

اپنے اپنے چھوڑے ہوئے ویسے ہی دیگر کام یاد آنے لگتے ہیں جو ان کے خیال میں تحریک کی موجودہ سرگرمیوں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں اور پھر لوگ آہستہ آہستہ بکھرنے اور اپنے اپنے ذاتی اہم اور ضروری کاموں کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں، اس طرح کسی تحریک کی، اپنے حقیقی کام سے دوری، اس پروگرام کے حامل لوگوں کی دوری کا ذریعہ بنتی چلی جاتی ہے اور تحریک سرد مہری اور غیر فعالیت کا شکار ہو جاتی ہے۔

فیصلہ کن اقدامات میں تذبذب :

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہر تحریک اپنا راستہ بنانے اور نصب العین کی منزل تک پہنچنے کے لئے جانگسل کشمکش سے گزرتی ہے۔ اُسے بیشمار اُلجھے ہوئے راستوں میں سے اپنا حقیقی راستہ متعین کرنا اور پیش قدمی کرنا ہوتا ہے جبکہ حالات کی ہر تبدیلی ایک فیصلہ کن اقدام چاہتی ہے۔ پھر سیاست میں ہمیشہ حالات کے پیچھے چلنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ خود حالات پیدا کرنا، حالات کا رُخ بدلنا اور حالات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر انہیں اپنی مرضی کے مطابق گردش دینا بھی ہوتا ہے۔ اگر کوئی تحریک صرف اِسی بات پر اکتفا کرتی ہے کہ جب اور جیسے حالات بھی پیدا ہوں گے اُس وقت ضرورت کے مطابق ویسے ہی فیصلے کر لئے جائینگے تو اس کی یہ بات ایک حد تک ہی درست ہوگی لیکن اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی یہ رَوش سیاست میں اس کی قائدانہ استعداد کو متاثر کرے گی کیونکہ زندگی کے سارے میدانوں میں راستے بنے بنائے نہیں ملتے بلکہ نظریاتی تحریکوں کو تو ہمیشہ ایسی ہی صورتحال سے واسطہ پڑتا ہے کہ وہ اپنے راستے خود ہی بناتی اور خود ہی پیش قدمی کرتی ہیں اس لئے کہ منزل

مقصود تک انہی کو پہنچنا ہوتا ہے دوسرے سب تماشائی ہوتے ہیں۔

بلاشبہ کسی تحریک کے تدبّر کا یہی تقاضا ہوتا ہے کہ فیصلے ٹھنڈے دِل و دماغ کے ساتھ کئے جائیں اور اطمینان سے اُن پر عملدرآمد ہو، لیکن کلّی اطمینان صرف اسی تحریک کو حاصل ہو سکتا ہے جو میدان کشمکش میں تنِ تنہا ہو۔ ایسی تحریک جب چاہے اپنی ضرورت کے مطابق حالات پیدا کرے، لیکن جب قدم قدم پر مسابقت ہو، میدانِ سیاست میں مختلف گروہ اجتماعی جدوجہد میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی پُرفریب چالیں چل رہے ہوں اور دوسری طرف عوام اپنے علم و فہم کی بے بضاعتی کے سبب مختلف گروہوں کی امتیازی خصوصیات سے بھی بے بہرہ ہوں، تو ایسی صورت حال میں تاخیر سے کئے گئے فیصلے یا دوسروں کے فیصلوں کی صرف تائید یا تردید اور کچھ نیم دِلانہ اقدامات کوئی وزن پیدا نہیں کر سکتے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نظریاتی تحریک کو شروع سے آخر تک ایک انقلابی تحریک کی حیثیت سے ہی پھیلایا اور چلایا۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے اور اقدامات ایسے بروقت ہوتے تھے کہ تاریخ کا طالب علم اُن سے بہتر اور بالترتیب اقدامات کا تصوّر نہیں کر سکتا۔

اگر کسی تحریک میں روایت ہی یہ بن جائے کہ کوئی فیصلہ کئے بغیر حالات کو اُن کے رُخ پر ہی چھوڑ دیا جائے تاکہ گزرنے والا وقت خود ہی فیصلہ کر دے اور یا پھر اہم مسائل کو حل کئے بغیر معلق کر دیا جائے تاکہ لوگوں کی طرف سے اُن کے حل کا تقاضا ہی دب جائے، تو ایسی صورتِ حال میں تحریک بتدریج پیچھے کی طرف لڑھکنے لگتی ہے، اس کے ہمدردوں کے حلقے میں اس کی کامیابی کے بارے میں

شکوک وشبہات جنم لینے لگتے ہیں۔ کیوں کہ نیم دِلی سے مسافت طے کرنے والوں کے ساتھ سفر کرنے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا، چنانچہ ہمسفروں کی تعداد بتدریج کم ہونے لگتی ہے اور تحریک سُست روی، بے یقینی اور تذبذب کے کنوئیں میں ڈوبنے لگتی ہے۔

قِیادت کی سُست رَوی:

کسی تحریک میں اضمحلال و انتشار پیدا ہونے کے داخلی اسباب میں دیگر عوامل کے علاوہ غیر فعّال قیادت کا بہت بڑا دخل بھی ہوتا ہے۔ قیادت کی غیر فعّالیت تحریک کو لے بیٹھتی ہے اور قیادت کی فعالیت تحریک کو بام ثریا پر پہنچا دیتی ہے۔ تحریک اگر ایک رواں دواں گاڑی ہے تو قیادت کو اس کے انجن کا درجہ حاصل ہے۔ انجن کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ تاہم انجن کی موجودگی میں بھی جو گاڑی نہ چلے، اُس کے انجن میں ضرور کوئی خرابی ہے اور اس میں حرکت و حرارت موجود نہیں ہے اسلام میں بھی قیادت کی اہمیت مسلّمہ ہے، بلکہ قیادت کو تو پورے نظام اجتماعی میں اہم ترین مقام حاصل ہے جس کی اطاعت معروف میں لازم قرار دی گئی ہے۔ اس لئے کہ پوری اجتماعیت کی جدّوجہد صرف اسی صورت میں نتیجہ خیز ہوسکتی ہے جب قیادت اپنی تمام صلاحیتوں سے کام لے کر اپنے سارے فرائض ادا کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر صحابۂ کرامؓ نے امّت کی قیادت کی اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف فوری توجّہ دی تھی۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"آگاہ رہو، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں اور اب اس دین کے لئے ایک ایسا شخص بہر حال ضروری ہے، جو دین کے قیام و نفاذ کا ذمّہ دار ہو۔"

اِسی سلسلے میں حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم نے فرمایا تھا:

"جماعت کے بغیر اسلام نہیں اور امارت کے بغیر جماعت نہیں۔"

اب ذرا اس بات کا جائزہ لیا جانا چاہیئے کہ وہ کون سی صفات ہیں جن کی بناء پر قیادت فعال اور مثبت کہلاتی ہے۔

سب سے اہم ترین صفت تو یہ ہے کہ قیادت کارکنوں کے دل میں گھر کر جائے۔ محبّت اور خلوص کی بنا پر ایسی قیادت جمہوری کہلانے کے قابل ہے اور صحیح مقبولیت اِسی کا نام ہے ـــــ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تمہارے اچھے خلفاء وہ ہوں گے جن سے تم کو محبّت ہو اور انہیں تم سے محبّت ہو، جن کے لئے تم رحمت کی دُعائیں کرو اور وہ تمہارے لئے دعائیں کریں۔" (مسلم)

مسلمانوں کی مطلوبہ قیادت کی یہ مثبت صفت بیان کرنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی برعکس صورت کو یوں بیان فرمایا:

"تمہارے برے خلفاء وہ ہوں گے، جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، جن پر تم لعن طعن کرو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔" (مسلم)

اسلامی قیادت کی فعالیّت کے لئے تیسری صفت دانائی اور بصیرت و حکمت ہے، قرآنِ حکیم نے فرمایا:

CamScanner

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء، ۵)

یعنی "اپنے مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے ہستی کا سہارا بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو"

بے بصیرتی اور حکمت و تدبّر کی کمی، اسلامی قیادت کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔ ایسے لوگوں کے قیادت پر فائز ہونے سے ملّت پر تباہی آتی ہے ایسے نادان لوگوں کی قیادت سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیئے گویا قیادت کی بصیرت وحکمت اور تدبّر دراصل رہنمائی کے لئے ضروری لوازم ہیں۔ جس کے بغیر کسی تحریک کو پیش آمدہ خطرات سے دوچار ہونے، گم کردہ راہ ہونے یا جمود میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے۔

قیادت کی چوتھی صفت امانت و دیانت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (النساء: ۵۸)

"اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں یعنی ذمہ داری کے مناصب صرف اس کے اہل لوگوں کے سپرد کرو"

صحیح اسلامی قیادت کی پانچویں صفت تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ قرآن حکیم کے مطابق:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات - ۱۳)

"تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو"

اسلامی قیادت کی چھٹی صفت علم و فضل اور موزوں صحت و جسمانی کیفیت بیان کی گئی ہے:

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

"نبی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حکمرانی کے لئے اس کو (یعنی طالوت کو) تم پر ترجیح دی ہے اور اس کو علم اور جسم میں سبقت عطا کی ہے۔ (البقرہ: ۲۴۷)

پھر نا اہل قیادت کے ذیل میں ایسے شخص کی اطاعت سے بھی روکا گیا ہے جو خدا کی یاد سے یکسر غافل ہو، جو خواہش نفس کی پیروی کرتا ہو اور جس کا کوئی کام اپابند حدودِ اسلام نہ ہو۔ قرآن نے فرمایا ہے:

"کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی اور جس کے اعمال اخلاقی حدود سے عاری ہیں"

قیادت کی اہلیت کے لئے یہ صفت بھی بتائی گئی ہے کہ وہ خود کسی منصب کا طالب نہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا:

إِنَّا لَا نُوَلِّي عَلَىٰ هَٰذَا الْعَمَلِ أَحَدًا سَأَلَهُ (ابوداؤد)

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہوگا جو خود (منصب کا) طالب ہو"

پھر قیادت کی مطلوبہ صفات میں ایک صفت عدل بھی ہے، جو ہر عصبیت، جانبداری اور لاگ لپیٹ کے مقابلے میں بے لاگ ہونا چاہیئے۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء: ۵۸)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ کرو!"

اس معاملے میں عدل کا معیار اتنا بلند اور مثالی رکھا گیا ہے کہ خود اپنی ذات کے خلاف بھی عدل کا تقاضا پورا کیا جانا لازم ہے۔ حضرت عمرؓ ایک عدالت میں حلفز ہوئے تو عدالت نے ان کے احترام کا قدرے اظہار کیا، انہوں نے منصف سے

CamScanner

مخاطب ہو کر سختی سے فرمایا: "میرے فریق مخالف کے مقابلے میں تم نے یہ پہلی بے انصافی کی ہے"۔

کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ کے خلاف دعویٰ میں ان کے اپنے بیٹے اور غلام کی گواہی قبول نہ کی گئی حالانکہ وہ دونوں سچے مسلمان تھے اور پھر حضرت علیؓ کی دیانت اور صداقت تو ہزاروں کی عداقت پر بھاری تھی۔ بلاشبہ انسان سب کے ساتھ عدل کر سکتا ہے لیکن اپنی ذات کے خلاف عدل کا تقاضا پورا کرنا جرأت قوتِ ایمانی اور خدا خوفی کے سوا ممکن نہیں ہے، جس قائد میں ذاتی محاسبے کا جذبہ اور صفت نہ ہو اس کے لئے غلطیوں سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ قیادت کو غلطیوں سے بچنے کیلئے شعوری اہتمام کرنا پڑتا ہے تاکہ تحریک کو غلط راستے پر جانے سے روکا جاسکے۔

اس کے علاوہ ایسے لوگوں کو قیادت کے لئے نااہل قرار دیا گیا ہے، جو حدود سے تجاوز کرتے ہیں، خدا اور رسول کی اطاعت میں تساہل کرتے ہیں، زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح پر قادر نہیں ہوتے۔ فرمایا گیا:

"ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے"

پھر کردار اور قوتِ عمل کی مضبوطی بھی قیادت کے اوصاف میں شامل کی گئی ہے:

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے ابوذر! میرا خیال ہے کہ تم کمزور ہو، میں تمہارے لئے وہی چاہتا جو اپنے لئے چاہتا ہوں۔ دیکھو تم دو آدمیوں پر بھی حکومت کی ذمہ داری قبول نہ کرنا اور نہ یتیم کا مال اپنی سپردگی میں لینا۔ (مسلم) ابوذر غفاریؓ کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ میں نے عرض کیا "یا رسول اللہ! مجھے آپ کسی جگہ کا حاکم بنا دیجئے" آپؐ نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر فرمایا:

"اے ابوذر! تم کمزور آدمی ہو، حکومت تو قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا سامان ہے ماسوائے ان کے لئے جو اس کا حق ادا کر دیں"۔ (مسلم)

اس سلسلے میں مثالی اسلامی تحریک کے قائد حضور اکرمؐ کا طرزِ عمل جو نمونہ رکھتا ہے، وہ بھی بے نظیر ہے۔ جن دنوں مدینہ میں دشمنوں کے حملوں کی بنا پر خوف و ہراس کا دور تھا، ایک رات یہ افواہ اڑی کہ مدینہ پر حملہ ہو گیا ہے۔ صحابہؓ کی جماعت جب تفتیشِ حال کیلئے باہر آئی، تو انہوں نے ایک سوار کو مدینہ کی طرف آتے دیکھا۔ یہ خود حضورِ اکرمؐ تھے، جو سب سے پہلے تن تنہا دور دور تک دشمن کا کھوج لگا کر اب واپس تشریف لا رہے تھے۔ آپؐ نے واپسی پر افواہ کو غلط بتایا۔ جنگ ہوازن میں جب تیروں کی بوچھاڑ میں اسلامی لشکر کو پسپائی کا سامنا تھا تو خود سالارِ فوج حضور اکرمؐ میدانِ جہاد میں ڈٹ کر لوگوں کو استقامت اور شجاعت کی تلقین کرتے رہے۔ مزید برآں غلبۂ اسلام کی تمام قابلِ ذکر جنگوں کی قیادت حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی۔

نیز قیادت کا خوشامد اور چاپلوسی کی فضا سے بچنا بھی بہت ضروری ہے، ورنہ خوشامدی حواری قائدین کو گمراہ کرنے اور ان کو نفس کی لذت لگا کر انہیں بھٹکانے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں، اسلامی تحریک کے قائد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ کے ارشاد کی روشنی میں خوشامد کرنے والے کے منہ میں خاک ڈالے اور اس کی ہمت شکنی کرے تاکہ قیادت بے لاگ ہو اور وہ نفس سے مغلوب نہ ہو۔

الغرض انقلابی تحریک کی بھرپور قیادت کے لئے، جبکہ وہ سیاسی جدّوجہد میں بھی داخل ہو جائے، صرف بے لوث طرزِ عمل اور واحد صفتِ اخلاص ہی کافی نہیں ہوتی، بلکہ سیاسی سوجھ بوجھ اور دنیوی و دینی بصیرت بھی درکار ہوتی ہے۔ مرزم

شناسی، تحریک کے نفع و نقصان سے آگہی، کارکنوں کے جذبات و تاثرات کا علم اور ان کی مناسب تہذیب و تربیت، مشکل حالات میں تحریک کے لئے راستہ نکالنے کی حکمت اور مخالفین سے ٹکر لینے کی ہمت و جرأت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی نظر تحریک کی صفوں میں دُور دُور تک جائے تاکہ اُسے صرف قریب کے ہی آدمی متوجہ نہ کرسکیں بلکہ لالۂ صحرائی بھی اپنا صحیح مقام حاصل کرپائیں۔ اسے دکھا دکھا کر کام کرنے والوں اور خاموشی سے اپنے فرائض سرانجام دینے والے ساتھیوں کا امتیاز بھی معلوم ہو۔ اس میں خوشامدیوں کی چالوں کو سمجھنے کا عنصر بھی موجود ہو۔ گویا قیادت کی صحیح رُوح سے سرشار ہونے کیلئے قائدِ تحریک کے پانچوں حواس کے علاوہ چھٹی حس بھی بیدار ہو، تاکہ اس کی موجودگی میں وجدان اور قیاس بھی صحیح کام کرسکے۔ قیادت کی خوبی کیلئے ضروری ہے کہ اس میں لگی بندھی ڈگر پر چلنے کی مقلدانہ عادت کے بجائے اجتہادی قوتیں بھی موجود ہوں، جو تحریک کے وسیع تر مفاد کو آگے بڑھانے کی خاطر نئے نئے راستے نکالنے میں ممد و معاون بنیں۔ ضرورت اِس اَمر کی ہوتی ہے کہ وہ قول و فعل کی یکسانیت سے تحریک کی رہنمائی کرے اور ہر پہلو سے اچھی مثال پیش کرسکے۔ وہ کسی کو دھوکہ نہ دے اور نہ ہی کوئی اُسے گمراہ کرسکے، بلکہ اپنی خداداد بصیرت سے سوادِ اعظم کو سبیل پر بڑھتا چلا جائے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو تحریک کی قیادت میں موجود ہوں تو جمود میں مبتلا ہونے کا احتمال کم ہوتا ہے۔ تاہم ایک روایتی ڈگر ہی مستقل راستہ اور مستقل پروگرام بن جائے تو اس تحریک کو اضمحلال سے دوچار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ قیادت فعّال ہونے کی صورت میں تحریک تیز تر اور قیادت کی سُست روی سے تحریک کی انقلابیت کا پہلو دَب کر بالآخر انتشار پر منتج ہوتا ہے۔ یہ سارے پہلو نہایت درجہ توجہ طلب ہیں جن کو نگاہ میں رکھے بغیر کسی تحریک کو سلامتی کے ساحل تک لے جانا ممکن نہیں ہوتا۔

فکر و عمل کی بیداری

اسلامی تحریک فطرتاً ایک انقلابی تحریک ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کے ہر شعبۂ زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا داعیہ رکھتی ہے اور اس کے پاس اس تبدیلی اور انقلاب کا واضح پروگرام اور نقشہ موجود ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ حالات و حادثات اور دیگر بے شمار وجوہ کی بناء پر انحطاط و اضمحلال کا عمل وارد ہونا کوئی خلافِ فطرت بات نہیں ہے، لیکن ساتھ ہی تحریک کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ وہ اِس فطری عمل کی رفتار کو ہلکا کرنے اور نتائج جدّوجہد، طاغوت کو شکست اور انقلاب کو مکمل کرنے کی صورت میں حاصل کریں تاکہ ایک تازہ دم پائیدار انقلاب آجانے سے زبردست تبدیلی کی رَو چل پڑے جس سے فطری اضمحلال و انحطاط کی رَو کو روکا جاسکے۔ کسی تحریک کا مطلوبہ انقلاب رونما ہونے سے اس میں پائیدار زندگی کا شعور تیز تر ہوجاتا ہے اور پورا معاشرہ اس کی پشت پر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اسلامی تحریکوں میں انحطاط و اضمحلال کے مختلف زاویوں اور گوشوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ کسی تحریک کا اضمحلال درحقیقت اس کی عدم فعالیت کا دوسرا نام ہوتا ہے اور تحریک کے اضمحلال کا واحد علاج تحریک کو قوت کے ساتھ ایک جاندار اور حقیقی تحریک بنا کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اگر ہمت کرکے فکر و عمل میں بیداری کے آثار پیدا کر دیئے جائیں تو پھر تحریک کو کوئی چیز مضمحل نہیں کرسکتی۔ تحریک کی جب

تک تنظیم موجود ہو اس کی حیثیت ٹائم بم کی ہوتی ہے جو فیتے کے سُلگنے کا انتظار کرتا ہے جب فیتہ کو سُلگانے والا کوئی ہاتھ اُسے میسّر آجاتا ہے تو وہ اپنی داخلی قوت کا برملا اظہار کرتا ہے ——— ہر تحریک اپنے اندر ایک داخلی قوت رکھتی ہے اور اسلامی تحریک کی داخلی قوت اس کا انقلاب انگیز کلمہ طیبہ ہے، جس کو پیش کر کے حضور اکرمؐ نے قریش سے فرمایا تھا کہ اگر تم اُسے اُٹھا لو تو عرب و عجم کی سربراہی تمہیں حاصل ہوگی۔ اسی کلمہ کی پوشیدہ قوت نے صحابہ کرامؓ کو مکہ کی جان لیوا آزمائشوں میں سے گزر جانے کی ہمت عطا کی تھی۔ اس کلمہ نے انہیں اتنی عزیمت دی تھی کہ وہ ہجرت جیسا عظیم الشان ایثار کر گئے اور دنیا کی ہر متاعِ غرور پر لات مار کر پردیس کی طرف صرف خدا و رسولؐ اور اپنے اصولوں کی خاطر نکل گئے۔ اسی کلمے نے انہیں بدر کے موقعہ پر مال و اسباب سے بھرپور قافلے کو نظر انداز کر کے اپنے سے تین گنا بڑی آہن پوش قوت کا مقابلہ کرنے کی عزیمت مہیا کی تھی اور اسی کلمے کی قوت سے وہ جنگِ احزاب میں پیٹ پر پتھر باندھ کر سارے عرب کے سامنے ڈٹ گئے تھے اور ہر طرف سے امڈے ہوئے جنگجو قبائل کا منہ پھیر دیا تھا۔ جس تحریک کے پاس کلمہ طیبہ جیسا قوت کا خزانہ موجود ہو اسے طاغوتوں سے ٹکر لینے اور ان کا مقابلہ کرنے میں اسباب و نتائج کا حساب لگانے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بدر و اُحد و احزاب میں اگر حساب لگا کر طاغوت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا جاتا تو شاید فیصلہ دوسرا ہوتا لیکن مردِ مومن ہمیشہ اپنی پشت پر ناقابلِ شکست قوت کا ہاتھ محسوس کیا کرتا ہے اور وہ مالک الملک ربُّ الافواج بہت عظیم ہے جو اپنے بندوں کے لئے گھمسان کی جنگ میں سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے اسلامی تحریکوں کو حکمت و تدبّر اور شجاعت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی کے

بل پر وہ خدا کے دشمنوں سے جنگ آزما ہوتی ہیں۔

بلاشبہ ایک بگڑے ہوئے معاشرے اور ایک اصلاحی تحریک کے درمیان ہمہ پہلو نوعیت کی کشمکش ہوتی ہے جہاں معاشرے کا بگاڑ ہمہ گیر ہوتا ہے وہاں تحریک کے پاس بھی انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لئے اصلاح کا ایک پروگرام ہوتا ہے نتیجتاً انقلابی تحریک اور معاشرے کے درمیان اصلاح اور بگاڑ کی کوشش کے سبب ایک ہمہ پہلو نوعیت کی کشمکش برپا ہو جاتی ہے۔ معاشرے کے در و بست پر قابض گروہ اپنی پوری توانائی سے ہر اصلاح کی راہ روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ صرف تحریک کو معاشرے میں نفوذ سے روکتا ہے تاکہ اصلاح کا عمل معاشرے کے کسی گوشے میں بھی پذیرائی حاصل نہ کرے ورنہ پھر ابلتے اور پھیلتے ہوئے چشمے کی طرح اس کے آگے بند باندھنا نہایت مشکل کام ہو جاتا ہے۔

اصلاحی تحریک کے راستے میں مزاحمتوں کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ اگر مزاحمتیں نہ ہوں تو بھی یہ لازم نہیں کہ ساری آبادی ہی اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ ہر معاشرے میں اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے رنگ برنگ کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر تحریک اپنے معاشرے میں سے حصہ پالیتی ہے۔ ہمیشہ کسی تحریک سے وہی لوگ دلچسپی رکھتے ہیں جنہیں اس کے اصولوں، پروگراموں اور طریق کار سے طبعی مناسبت ہوتی ہے جبکہ عام لوگ تماشائی بنے دور سے صرف تحریک کے نتائج جد و جہد پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی تحریک سے الگ رہ کر مشکلات سے پہلو بچاتے ہوئے فتحیاب فریق کے حق میں زندہ باد کے نعرے لگا دینا اور شکست کھانیوالے فریق پر بلا جواز لعنت و ملامت کے تیر برسا دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ چنانچہ تحریک کے عمومی مزاج سے واقفیت

نہ رکھنے والے لوگ اس دلدل میں بآسانی پھنس جاتے ہیں۔

ایسے لوگ ایک لمبے عرصے تک باطل کے تحت رہتے رہتے اپنے مزاج کے اعتبار سے اُسے گوارا کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسے افراد کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہونے کے بعد باطل کے ماحول، فضا اور گردوپیش سے پوری طرح مانوس ہوتے ہیں۔ البتہ ان کو ہر وہ شے غیر مانوس اور اجنبی محسوس ہوتی ہے جو رائج باطل نظام کی مخالف یا اس سے متصادم ہو۔ اس لئے وہ بھی تحریک کو سمجھے اور پرکھے بغیر اسی گروہ کی طرف جاتے ہیں جو اس مادی نظام کی بقاء اور خدمت کے لئے آگے آتا ہے۔

دوسری طرف تحریک کے نصب العین کو اپنا شعوری نصب العین بنا کر رضاکارانہ طور پر آئے ہوئے لوگ ہی دراصل اس تحریک کے جسم و جان ہوتے ہیں، جن کو فعّال و متحرک رکھنے پر ہی تحریک کی حرکت و فعّالیت کا دارومدار ہوتا ہے۔ ان کو فعّال و متحرک رکھنے سے زیادہ تحریک کے اندر اہم اور تعمیری کام اور کوئی نہیں ہوتا۔ مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس نفسیاتی بات کو اپنے ایک مضمون میں کچھ یوں بیان کیا ہے:

"انکشافِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو اس مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتا جہاں وہ انکشاف سے پہلے تھا، بلکہ وہ اُسے کشاں کشاں اس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اُسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اُسے قبول کرتے ہیں ان کی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصول کی خاطر دوستیوں، اور خونی و قلبی رشتوں تک

کو قربان کر دیتے ہیں، وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ پہلو ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، اُن کے خصائل میں تغیر آجاتا ہے یہاں تک کہ اُن کی شکل، صورت، لباس، خوراک اور عام طرزِ زندگی پر بھی اس کے اثرات اس قدر نمایاں ہوتے ہیں کہ گردوپیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لئے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔"

فکر و عمل کی اس عظیم بیداری سے جو لوگ بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی حرکت و فعّالیت و کارکردگی میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے لوگوں کا گروہ ہی اپنی اجتماعی قوت و توانائی کے بل پر بڑے بڑے گروہوں پر غالب آجایا کرتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اصلاح و انقلاب کا عمل ہمیشہ چھوٹے اور منظم گروہ کے ہاتھوں ہی بڑے اور غیر منظم گروہوں کے مقابلے میں، اُن کی مزاحمت کے علی الرغم، بروئے کار آیا کرتا ہے۔ اس ہتھیار کو باطل قوتوں کے خلاف مؤثر طور پر استعمال کرنے کا کام وہ قیادت کرتی ہے، جو اس گروہ کو لے کر میدانِ جدّوجہد میں اُترتی ہے۔ بہرحال ساری کشمکش کے نتائج کا دارومدار اُس قیادت کی حکمتِ عملی، بروقت فیصلوں اور موزوں اقدامات پر ہوا کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں آگے بڑھنے اور باطل پر ضربِ کاری لگانے کے مواقع تو کبھی کبھی ہی آتے ہیں اور اُن سے فائدہ اٹھانے کا کام کوئی انقلابی قیادت ہی کر سکتی ہے۔ اگر وہ فعّال، نظریاتی اعتبار سے جرأت مند اور مدبّر ہو، تو وہ دشمن کے ہر وار کو حکمت و تدبّر سے روک سکتی ہے۔

CamScanner

کامیابی کی منزل تک پہنچنے یا درمیانِ راہ میں منتشر ہو جانے کا بہت کچھ دار و مدار قافلہ سالار پر ہی ہوتا ہے۔ کوئی قافلہ سالار بھی اس تاریخی ذمہ داری سے پہلو تہی نہیں کر سکتا کہ اس کی حیثیت گاڑی کے انجن کی ہوتی ہے، اُس کی حرکت سے گاڑی حرکت میں رہتی ہے اور اس کے ٹھہر جانے سے گاڑی ٹھہر جاتی ہے اور اس کے رُخ بدلنے پر گاڑی رُخ بدل لیتی ہے۔ وہ آخری ذمہ داری اور تاریخی جوابدہی کے مقام پر ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے بعد مشاورتیں، تجاویز اور طریقہ کار سب تاریخ کے پسِ پردہ چلے جاتے ہیں اور کامیابی و ناکامی کی آخری ذمہ داری اسی فرد کے نام کے ساتھ وابستہ رہ جاتی ہے جو سب سے آگے کھڑا ہوتا ہے۔ وہ واقفِ راہ ہو تو راستے خود کھلتے جاتے ہیں۔ وہ بھٹک جائے تو پورا قافلہ بھٹک جاتا ہے۔ وہ جرأت و شجاعت کا پیکر ہو تو کمزور تنکے بھی بھالے بن جاتے ہیں۔ وہ مصلحت کوش ہو تو مردانِ کارزار بھی پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ وہ مدبر و نکتہ ور ہو تو اُلجھے ہوئے مسائل کی گتھیاں بھی سلجھتی چلی جاتی ہیں۔ وہ حکمتِ کار سے ناآشنا اور تدبر و بصیرت سے بے بہرہ ہو تو سلجھے ہوئے سیدھے سادے مسائل بھی پیچیدہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ غرض تاریخ کی شاہراہ راہنما افراد کے نشانِ قدم کے ذریعہ ہی تحریک کے مراحل کا پتہ دیتی ہے۔

تحریک کی قیادت کے لئے نصب العین اور طریق کار کے تعین کے بعد ایک نقشۂ کار مرتب کرنا بھی ناگزیر ہوتا ہے۔ ایک ایسا پروگرام جو تحریک کو عوام کے فہم کے قریب تر کر دے ——— اسلامی قیادت کے لئے صبر و حکمت، خدا خوفی اور بے ریا ایثار کی صفات ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مغربی انداز کی قیادت نظریاتی راہ و رسمِ منزل سے قطعی عاری ہوتی ہے۔ جبکہ بامقصد اجتماعی جدّ و جہد کی سربراہی امانت و دیانت کے اصولوں پر مبنی

ہوتی ہے نفوذ کرنے والے پروگرام کو لازماً معاشرے کے جسم و روح دونوں کی بنیادی ضروریات کا کفیل بن کر سامنے آنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک کا جماعتی تشخص بھی انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اس طرح وہ تحریک سامنے آئے جو اس پروگرام کی حامل ہے، اور تحریک کے توسط سے ایسا پروگرام ملے جو عوام کے مسائل کا علاج ہے چنانچہ جب لوگ ایسے پروگرام کو اپنے مسائل کا حل سمجھ کر اختیار کرنا چاہیں، تو اس گروہ کے سوا دوسرے کسی گروہ کی طرف نگاہ نہ کریں۔ تحریک اور اس کے پروگرام کا باہم یہ تشخص بے آمیز اور غیر مشتبہ ہونا چاہیئے۔ تحریک اپنی جدّ و جہد میں مستقل مزاج اور متواتر ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے اور کبھی بھی سہی بے نظریہ گروہ کی سطح پر نہ اُترنے پائے۔ اس کا اپنا پلیٹ فارم خوب معروف اور نمایاں ہو اور اس کی پالیسیاں اس کے نظریے کی بے لچک نمائندگی کرتی ہوں تو وہ تحریک عوام میں نفوذ کر سکتی اور مقبول ہو سکتی ہے۔

اجتماعی اور نظریاتی تشخص کی امتیازی شان قائم رکھنے کے بعد منزلِ مقصود کے طویل سفر کو مختلف منازلِ راہ میں تقسیم کرنے کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ تاریخِ قرآن کے مطالعہ سے یہی حقیقت ملتی ہے کہ اسلامی نظام بھی اوّلین دور میں تدریج و ترتیب کے ساتھ ہی نافذ ہوا تھا جو اصولی نصب العین کے ساتھ جزوی طریقِ کار کی طرف واضح اشارہ ہے چنانچہ اب بھی ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرتی اور اخلاقی زندگی کے اندر اسلامی احکام کو مختلف مدارج و مراحل میں نافذ کرنے کے لئے منتخب کیا جائے۔ اسلام کے نام لیوا حکمرانوں اور جمہوری اداروں کو اُن کے نفاذ پر جمہوری انداز سے مجبور کیا جائے۔ اسلام کی قانونی تعزیرات کو ملکی قوانین میں ڈھالنے کے لئے پارلیمانی مراحل میں سے گزرنا ہوگا اس صورت میں ظاہر ہے کہ تشکیلِ قانون کی تدریج اور اس کے مدارج تو لازماً ملحوظ

رکھے جائیں گے شراب اور جوئے جیسی عام فہم برائیوں کو پہلے قدم پر بند کرانے کے لئے عوامی جدّوجہد منظم کی جائے تاکہ ان محاذوں پر کامیابی حاصل کرکے کارکنوں کے اندر اُمید کی شمع روشن کی جائے اور ان کا اپنی جدّوجہد پر اعتماد بحال ہو۔ لیکن اس ضمن میں محض اعلان اور چند اقدامات ناکافی ہیں، ان منکرات کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے اخلاص کے ساتھ ہی اصولی حکمت عملی درکار ہے اسی طرح ایک کے بعد دوسری برائی کو نشانہ بنا کر ایک طرف تو اس کے خلاف اسمبلی میں قانون سازی کی جائے اور دوسری طرف عوامی تحریک منظم کی جائے تاکہ برائی کے خلاف ان اسلامی اصلاحات اور اقدامات کو عوامی تائید حاصل ہو سکے۔ اس طرح مرحلہ وار اور قدم بہ قدم تحریک کو اصل منزل کی طرف آگے بڑھایا جائے۔ یوں عوامی ریلہ اسلامی تحریک کی پشت پر اس طرح آجائے کہ حکومت کیلئے ہر اصلاح کے آگے جھکنے یا پھر ملک کی باگ ڈور چھوڑ دینے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہ رہے۔ اس طرح ایک وقت لازماً آئے گا جب پوری شریعت کے نفاذ کی مہم آسانی سے منظم کی جا سکے گی اور اس کا راستہ روکنا کسی کیلئے بھی ممکن نہ ہوگا۔

کسی نظام کے نفاذ کے لئے جس نوعیت کی ملک گیر تحریک کی ضرورت ہوتی ہے، وہ روزمرہ کے مروّج پروگراموں سے کبھی وجود میں نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے تو ہر ایک کارکن کو اپنا آرام و آسائش تج کر میدانِ عمل میں آنا پڑتا ہے تاکہ ملک کے مرکزی مقامات سے لے کر چھوٹی آبادیوں تک سب جگہ تحریک کی دعوت اور پروگرام پہنچانے کیلئے ہمہ گیر پروگرام کی منصوبہ بندی ہو۔ یہاں تک کہ معاشرے کے بحرِ ذخار میں حرکت آئے اور ہر گوشے اور کونے میں تحریک کی بات نہ صرف پہنچ جائے بلکہ لوگوں کی زبان پر بھی چڑھ جائے۔ پورے معاشرے کے سامنے ایک فیصلہ کن مرحلہ آجائے جس کے زور

سے معاشرے میں ایک ایسے بہاؤ کی کیفیت پیدا ہو جائے جو غیر جانبدار افراد کو بھی اپنے ساتھ لے جائے اور وہ اپنی آزاد مرضی سے تحریک اور اس کے پروگرام کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیں۔ جمہوری معاشروں میں ذہنی بہاؤ پیدا کئے بغیر کوئی جمہوری تبدیلی لانا ناممکن نہیں ہوتا لیکن معاشرے میں ذہنی بہاؤ پیدا کرنے کا کام جان توڑ محنت چاہتا ہے۔ یہی وہ کوہ کنی ہے جس کے تصوّر سے ہی بڑے بڑے فرہادوں کا زہرہ آب ہو جاتا ہے۔ جب تک کوئی تحریک اور اس کے کارکن یہ کوہ کنی نہ کرلیں، نظامِ باطل کی پیدا کردہ مشکلات کے پہاڑوں کو کاٹ کر اسلامی نظام کی نہر کو شر نکالنا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ نظامِ حق کو چلانے کی وہی لوگ صلاحیت ثابت کر سکتے ہیں، جو اُسے لانے کی مشکلات و مصائب کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ و ہمت رکھتے ہوں ـــــ حضرت انسؓ بن مالک سے ترمذی نے روایت کی ہے کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آزمائش جتنی سخت ہوگی اتنا ہی بڑا انعام ملے گا بشرطیکہ آدمی مصیبت سے گھبرا کر راہِ حق سے بھاگ نہ کھڑا ہو، اور اللہ تعالیٰ جب کسی گروہ سے محبت کرتا ہے، تو اس کو مزید نکھارنے اور صاف کرنے کے لئے آزمائشوں میں ڈالتا ہے۔ پس جو لوگ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں اور صبر کریں تو اللہ اُن سے خوش ہوتا ہے اور جو لوگ اس آزمائش میں اللہ سے ناراض ہوں تو اللہ بھی اُن سے ناراض ہو جاتا ہے۔"

اس راستے میں بدی کو نیکی سے دفع کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا:

"نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔"

صبر و حکمت اسلامی تحریک کا طرزِ عمل ہے۔ تحریک کا دورِ تیاری سخت آزمائشوں

CamScanner

سے بھرپور ہوتا ہے اور اس دور میں تحریک کے ہر کارکن کیلئے یہی حکم ہے کہ وہ ہر مصیبت کے مقابلے میں صبر سے کام لے اور مستقل مزاجی سے اپنے طریقے پر قائم رہے۔ حضورؐ نے اپنے ایک ساتھی سے خود فرمایا کہ اسلام کے سلسلے میں سب سے جامع بات یہ ہے کہ:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مشکوٰۃ) "آمنت باللہ کہو اور پھر اس پر جم جاؤ"۔

حضورؐ کی اسلامی تحریک کا مکی دور اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ بڑے بڑے جوان مردانِ اسلام جنہوں نے بعد میں روم و ایران کو فتح کیا اور قلعہ خیبر کے دروازے کو اپنی قوتِ بازو سے اکھاڑ دیا۔ جنھوں نے بدر کے اندر کفار کے پہلوانوں کو ککڑی اور کھیرے کی طرح کاٹ کر رکھ دیا وہ مکے کی گلیوں میں گھسیٹے، مارے اور لہولہان کئے گئے لیکن صبر کی مہر اُن کے لبوں پر اور استقامت کی قوت ان کے دلوں میں قائم رہی اس لئے کہ ابھی تو سونے کو تپا تپا کر کندن کیا جا رہا تھا اور راست اقدام کیلئے متوازن اور متناسب قوت جمع نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ انہی دنوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ساتھی کو گذشتہ دور کے ایک نبی کا ایسا قصہ سنایا جس میں خود حضورؐ کی اپنی تمثیل موجود تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ دعوت دینے کے جرم میں ایک نبی کو اتنا مارا گیا کہ لہولہان کر دیا اور نبی کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جاتے اور یہ کہتے جاتے: اے اللہ! میری قوم کے اس جرم کو معاف کر دے، یہ ناواقف لوگ اصل حقیقت کو نہیں جانتے"۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکے سے مدینے کی طرف ہجرت نے اس عظیم اسلامی

تحریک کے سامنے عدم مزاحمت اور مزاحمت یا قوت کے عدم استعمال اور استعمالِ قوت کے فرق کو پوری طرح نمایاں کر دیا۔ بلاشبہ ہجرت راست اقدام کے لئے واضح علامت بن کر سامنے آ گئی ——— تحریک کے ساتھ چلتے ہوئے خدا کی راہ میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے اس لئے کہ صبر و استقامت ہی وہ قوت ہے جس کے بل پر تحریکیں آگے بڑھتی اور مخالف حالات کا زور توڑ کر اپنے مطلوبہ نظام کے لئے راستہ بناتی ہیں۔

اس لیے مالک کائنات نے اسلامی تحریک کے داعیوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ:

"کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے، ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی ——— اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے"۔

ہمارے دور کے ایک عظیم قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک جابر حکومت کے جبر و تشدد کی چلتی ہوئی گولیوں کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے یہی بے لاگ اور پُرحکمت بات کہی تھی:

"میرے عزیز ساتھیو! اللہ کے دین کے لئے جس کو کام کرنا ہو اس میں دو صفتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ایک صبر دوسرے حکمت۔ صبر کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی راہ میں جو رکاوٹ بھی ڈالی جائے اُس پر نہ تو مشتعل ہو کر آپ ذہن کا توازن کھو بیٹھیں اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنے مقصد

کے بجائے رکاوٹ ڈالنے والے کا مقصد پورا کریں بلکہ ہر رکاوٹ پیش آنے پر آپ کا عزم جوں کا توں قائم رہنا چاہیئے اور جذبات کی گرمی سے اپنے دل و دماغ محفوظ رکھ کر آپ کو وہ راہ اختیار کرنی چاہیئے جو حکمت کے مطابق ہو۔"

پھر آگے چل کر حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"حکمت یہ ہے کہ آپ بس ایک ہی لگی بندھی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے کے عادی نہ ہوں، بلکہ آپ میں یہ صلاحیت ہو کہ ایک راستہ بند ہوتے ہی دس دوسرے راستے بروقت نکال لیں۔ جس شخص میں حکمت نہیں ہوتی، وہ ایک راہ کو بند پا کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے ساتھ اگر بے صبر بھی ہو تو پھر یا تو اس رکاوٹ سے اپنا سر پھوڑ لیتا ہے یا راہ روی سے ہی باز آجاتا ہے مگر جسے اللہ نے حکمت اور صبر دونوں سے نوازا ہو وہ جوئے رواں کی طرح ہوتا ہے جس کی منزل کوئی چیز بھی کھوٹی نہیں کر سکتی چٹانیں منہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور دریا کسی اور طرف سے اپنی منزل کی طرف بہہ نکلتا ہے۔"

اب آپ دورِ نبوت کی اسلامی تحریک میں سے حکمت کی مثال لیجئے۔ یہ مثال صلح حدیبیہ ہے۔ کفار مزاحمت پر آمادہ ہیں۔ مسلمانوں کی نفری اپنی تعداد، حالات، محلِ وقوع اور قوت کے لحاظ سے ناکافی ہے اور تبلیغِ دین کے لئے نئے نئے راستے نکالنے کی ضرورت ہے۔ قائدِ تحریک کفار کی مزاحمت پر طرح دے جاتے ہیں۔ بعض شرائطِ صلح بظاہر مسلمانوں کو ناپسند ہیں اور کمزوری کا نشان نظر آتی ہیں لیکن قائدِ تحریک آئندہ کے وسیع تر تبلیغی امکانات پیدا کرنے کے لئے صلح و مصالحت کا راستہ اختیار

کرتے ہیں۔ قرآن صلح و مصالحت کی اس کارروائی کو فتحِ مبین قرار دیتا ہے اور واقعی وہ فتحِ مبین بن کر رہتی ہے۔ تحریک کو ایک بڑے دشمن کے ساتھ مستقل تصادم سے چند دنوں کے لئے نجات مل جاتی ہے جس سے فائدہ اٹھا کر متعدد چھوٹی بڑی فتوحات، قبائل سے معاہدات اور تبلیغ کے ذریعہ تحریک کے لئے کامیابی کے بے شمار دوسرے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ جوش و جذبہ اور حکمت کار کا باہمی تعلق متوازن اور معقول ہو تو تحریک کا کام بڑھتا ہے۔ جوش و جذبہ نہ ہو صرف حکمت ہو تو راستہ طویل اور سفر بوجھل ہو جاتا ہے۔ صرف جوش و جذبہ ہو اور حکمت نہ ہو تو تحریک راستے میں آنے والی کسی بھی چٹان سے سر پھوڑ کر ختم ہو جاتی یا میلوں دور پیچھے چلی جاتی ہے۔

جوش و جذبہ کی مثال پٹرول کی سی ہے۔ پٹرول کے ڈرم کو بیک وقت آگ لگا لیجئے تو وہ تباہی کا سامان ثابت ہوگا اور گاڑی کے انجن میں ڈال کر تھوڑا تھوڑا کنٹرول کے ساتھ استعمال کیجئے تو طویل منزلیں بھی مختصر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے صبر و حکمت جہاں کسی تحریک کے لئے سمتِ منزل متعین کرنے اور پھر کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے تدبیرِ منزل کرنے میں مدد دیتے ہیں وہاں جوش و جذبہ تحریک کی داخلی قوت اور توانائی کو برقرار رکھنے اور بڑی سے بڑی کھکھیڑ سہہ جانے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ صبر و حکمت کا تعلق فہم و دین سے ہے تو جوش و جذبہ کا تعلق یقینِ محکم اور ایمانِ مستحکم سے ہے۔

ان دونوں چیزوں کے بھروسے پر عوام میں گھس کر جان توڑ مشقت اور محنت سے ہر شے کو تج کر دیوانہ وار تبلیغِ دین کا کام کیا جائے تو مسلمانوں کے جمود شدہ معاشروں میں بھی حرکت، فعالیت اور فہم و شعور کی جذباتی ہلچل پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ ہلچل اگر پیدا

ہو جائے اور مسلمان عوام یکسو ہو کر کسی تحریک کی جرأت مند قیادت اور دیوانے کارکنوں کے پیچھے لگ جائیں تو پھر منزل دور نہیں رہ جاتی۔ ان عوام کو ساتھ لے کر کوئی تحریک جمہوری طریقے پر انتخابی میدان میں اترے یا انقلابی طریقے پر باطل قیادت کو بدلے، دونوں صورتوں میں عوامی قوت اس کے ہمراہ ہو جاتی ہے اور اس کے سامنے موقع و محل کے لحاظ سے دونوں تدابیر سے فائدہ اٹھانے کا راستہ سامنے موجود ہوتا ہے۔ پھر یہی طریقہ تحریک کے داخلی اور خارجی انحطاط و انحلال اور جمود و انجماد کا علاج بھی ثابت ہوتا ہے۔

لیکن عوام کے بحرِ ذخار میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے زبردست جان توڑ محنت، ریاضت، یکسوئی کی جدّوجہد اور جرأت مندانہ اقدامات کی ضرورت ہے۔ اور یہی وہ کوہ کنی ہے جس کے تصور سے ہی بڑے بڑے فرہادوں کا زہرہ آب ہو جاتا ہے لیکن جب تک کوئی تحریک اور اس کے کارکن یہ کوہ کنی نہ کریں نظامِ باطل کی پیدا کردہ مشکلات کے پہاڑ کاٹ کر اسلامی نظام کی رودِ کوثر نکالنا کسی صورت بھی ممکن نہیں ہوتا۔ نظامِ حق کو چلانے کی وہی لوگ صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں جو اُسے لانے کی مشکلات و مصائب کو بھی برداشت کرنے کا حوصلہ و ہمت رکھتے ہیں۔